ماہنامہ (مجلہ)

حیاتِ نو

بلریاگنج

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ بلریاگنج

حیاتِ نو

جلد ۵-۶ — شمارہ ۱۲-۱

دسمبر، جنوری سنہ ۱۹۹۰ء

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

مدیر

محمد اسمٰعیل فلاحی

بدل اشتراک

سالانہ زر تعاون: ۴۰ روپے

خصوصی تعاون: ۱۰۰ روپے

غیر ممالک: ۲۰ امریکی ڈالر

قیمت فی شمارہ: ۴ روپے

اس شمارے کی قیمت: ۵ روپے

مضمون نگاروں کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح بلریاگنج، اعظم گڈھ یوپی

[illegible]

نقوش حیات نو

صفحہ نمبر

• اداریہ — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۳

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں

مطالعہ حدیث

ایمان کی مٹھاس — مولانا محمد طاہر عمری — ۱۰

بحث و نظر

مولانا مودودیؒ کا تصور حدیث و سنت — خورشید احمد ندیم — ۲۱

لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم — محمد قطب، استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ — ۳۰

عظمت کے مینار

حضرت صہیب رومیؓ — مولانا اقبال احمد قاسمی — ۴۰

الخوارزمی اور اس کی مشہور تصنیف مفاتیح العلوم — شیخ بدر القاسمی — ۵۲

توجہ مطلوب ہے — عبدالبر اثری فلاحی — ۴۹

تعارف و تبصرہ — عبدالبر اثری فلاحی — ۵۹

اخبار علمیہ — شہنواز قمر بہاری — ۷۳

بین الاقوامی قرآن کمیشن

۳۰ لاکھ الفاظ پر مشتمل اردو لغت کی تیاری آخری مراحل میں

جامعہ کے لیل و نہار — نور محمد فلاحی

جامعۃ الفلاح کو صدمہ — ۶۰

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے — محمد اسمعیل فلاحی — ۶۱

حلقہ یاراں — احمد سجاد، ایم اے شمسی، عبدالمالک جھنوی — ۸۰

شعر و نغمہ

غزلیں — ابوالمجاہد زاہد، اعجاز کھیم پوری — ۲۸، ۵۳، ۴۳

"وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں"

ہندوستان کے ٹکڑے ہو چکے تھے تقسیم کی قینچی اپنا کام کر چکی تھی، عصبیت اور درندگی کی خون آشام طبیعت نے ہزاروں افراد کو نگل لیا تھا۔ ہزاروں بچے یتیم، ہزاروں دوشیزائیں بیوہ اور لاکھوں افراد خانماں برباد ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں رہ جانے والا مسلمان شاخ بریدہ کے مانند تھا، بے سہارا، نادار، یاس و قنوط میں گرفتار، حیرت اور استعجاب کی تصویر بنا پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا، لیکن کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جامع مسجد کے میناروں سے مولانا ابوالکلام آزاد کی گرج مسلمانوں نے سنی تھی۔ مولانا نے کہا تھا۔

"یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ دلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے......

...... میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یاد کے طور پر نظر آتے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا۔ انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں، تو پھر تمہیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو۔ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو،

کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک جال تھا، یہ بادلوں نے جلا پانی برسایا ہے، تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ یہ تمہارا رستہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔"

لیکن مولانا اس سے آگے نہ جا سکے، مطلع سے وہ بزرگ بھی غائب تھے جو یہ کہا کرتے تھے۔ پہلے انگریزوں کو بھگا لینے دو۔ بعض ازاں ہم اسلام اور اسلامی نظام کے لئے نقشہ کار تیار کر لیں گے۔ اس مہیب و گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اگر کسی کے اندر کچھ حرکت ہوئی اور کوئی کچھ کرنا چاہتا۔ تو کچھ ملے جلے دستوری حقوق اور کچھ قومی تحفظات کی بات سے آگے بالعموم پرواز نہیں ہوتی۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلامی نظام کے قیام کی بات کم بلکہ خلاف مصلحت اور دیوانے کی بڑ سمجھی جاتی۔ ان حالات میں تحریک اسلامی کے بچے کھچے افراد اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

انھوں نے نئے سرے سے اپنے آپ کو منظم کیا اور طے کیا کہ ہم اقامت دین کے لئے کام کرتے رہیں گے، اور اس سلسلے میں کوئی مصالحت نہ کریں گے۔ انھوں نے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کو اپنا میر کارواں منتخب کیا۔ ایک ایسے عہد میں جبکہ اسلامی نظام کی بات کرتے ہوئے دل بیٹھنے لگتے اور ہمتیں جواب دینے لگتی تھیں مسلمانوں کے اس لٹے پٹے اور بچے کھچے قافلہ کی "حدی خوانی" کے لئے خود کو تیار کر لینا چھوٹوں کی تیغ زنیوں کا کھیل نہیں، بڑے دل گردے کی بات تھی صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ

"اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش"

باطل کی طرف تیز تر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ لیکن اپنے ہی کیمپ، اور اپنے ہی دوستوں کے تیروں سے دل و جگر چھلنی ہوئے جاتے تھے۔ ایک طرف ارباب حکومت ہندو احیاء پرستی کے علمبردار اور دہریے جبر و دہشت کرتے رہے تھے، دوسری جانب اپنے ہی بزرگ اور اپنے ہی علماء دعوت مبارزت دے رہے تھے، تیسری طرف مسلمانوں کے مخصوص ملی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی مسائل تھے، چوتھی طرف فرقہ وارانہ فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جس کا مسلمان شکار ہو رہے تھے۔ ایسے تھے وہ حالات جن میں یہ کاروان عشق و مستی آگے بڑھتا رہا اور اس کی کشتی کو کھیتا رہا۔ یہ مرد خدا جسے ابواللیث کہئے یا قیس محمد کہئے

عشق بڑھتا رہا سوئے دار و رسن زخم کھاتا ہوا مسکراتا ہوا راستہ روکتے رہ گئے زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے

صبح آزادی کے بعد سے وفات سے چند ماہ قبل تک ۔ بیچ میں ذرا انقطاع کے ساتھ یہ مرد آہن ابواللیث اصلاحی تحریک اسلامی ہند کی قیادت کی اور مہیب موجیں اٹھتی رہیں طوفان حوادث سر سے گزرتے رہے۔ طعن و تشنیع اور فتووں سے اس کی سماعتیں تک استقبال کرتی رہیں

اللہ کے فضل و کرم سے جماعت اسلامی ہند کے اندر جدید و قدیم دونوں میدانوں سے ایک سے بڑھ کر ایک اصحاب فکر و تدبر افراد موجود رہے ہیں۔ اختلاف آرا یہاں بھی ہوتا رہا ہے جہاں پڑھے لکھے صاحب رائے و تمیز اور عقل و شعور رکھنے والے دماغ موجود ہوں گے وہاں یہ ناگزیر ہے اور یہ کوئی نامناسب بات بھی نہیں۔ نامناسب تو اس کا حد اعتدال سے آگے بڑھنا اور فطری اور شرعی حدود و قیود سے تجاوز کرنا ہے۔ ان مختلف الرائے اور مختلف الخیال لوگوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھنا، ایک مرکز سے باندھے رکھنا، اور انھیں منتشر و پراگندہ اور بکھرنے نہ دینا، ایک دو دن نہیں اتنے لمبے عرصے تک یقیناً یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اور اس کا سہرا بڑی حد تک مولانا ابواللیث مرحوم کو جاتا ہے۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانہ میں فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

صحرائی خصوصیات رکھنے والا "اقبال کا یہ مردِ مومن" ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد چار اگست ۱۹۲۵ء کو مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہو گئے تھے۔ عربی چہارم کے بعد اسے ندوۃ العلماء جانے کا خیال آتا ہے اور وہ ندوہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ یہیں سے اس کی عملی کا آغاز ہوتا ہے۔ صحافتی میدان میں دنیا اس کی لیاقت و قابلیت کو اخبار "مدینہ" بجنور میں کچھ دنوں تک دیکھتی ہے۔ بار بار آکولہ، بہار شریف بھی اس کی خدمات سے بہرہ مند ہوتا ہے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں اس کی معلمی کا دور یادگار ہے یہ پہلا دور ۱۹۴۵ء کے آس پاس کا ہے۔ دوسرا دور ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ کا ہے جب کہ آپ کو بار بار آکولہ، بہار شریف سے مجبور کر کے اصلاح بلایا گیا۔ اس موقع پر مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کو "پٹھان کوٹ" اور مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کو "بستی" سے بلایا گیا تھا۔ اصلاح کی معلمی ہی کے زمانے میں ۱۹۶۱ء میں بحیثیت امیر جماعت انتخاب عمل میں آیا۔

مولانا مرحوم کوئی شعلہ بیان مقرر نہیں تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر اور رک رک کر بولتے۔ بنیاد پر زور دیتے، تقسیم کا سختی سے پابندی کرتے اور کرواتے۔ انہیں اپنی طاقت کا خوب اندازہ تھا۔ انھوں نے غلط اندازہ کبھی نہیں لگایا ملی اور ملکی حالات پر گہری نظر رکھتے اور بروقت اور مناسب قدم اٹھاتے، نہ بزدلی کا شکار ہوتے نہ بے جا جوش کا مظاہرہ کرتے۔

ایک مضبوط اور پختہ سیرت کے مالک تھے۔ قرآن و حدیث میں جیسا مرد مومن ملتا ہے مولانا کی ذات میں وہ مرد مومن ہمیں نظر آ سکتا ہے۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے آتے جاتے ہر وقت خدا کو یاد کرنے والے اس کی صفات کا شعور رکھنے اور زبان سے اس کا ذکر کرنے والے۔ وہ دعاؤں کا خاص اہتمام رکھتے۔ تسبیح اور اوراد و وظائف کے عادی تھے۔ سفر میں ہوں کہ حضر میں رات کے آخری حصہ میں ان کا مصلّے بچھا رہتا۔ نماز تہجد کے بعد ہاتھ اٹھا کر دیر تک لمبی لمبی دعائیں مانگتے۔ انتہائی محتاط تھے بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولتے۔ ایک ایک لفظ نہایت تول کر نکالتے۔ بیجا بحثوں، بے محل تنقیدوں اور غیبت کا دور دور تک امکان نہیں تھا۔ جیسے باہر انتہائی احتیاط برتتے ویسے ہی گھر میں اور بالکل اپنے لوگوں کے

درمیان بھی رہے۔ گھر اور باہر میں اس پہلو سے کوئی فرق نہیں تھا۔ گھر اور باہر کی یہ یکسانی بغیر بے پناہ تقویٰ اور خوف خدا کے نہیں ہو سکتی۔ وہ تقویٰ جو دین و دماغ کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکا ہو، جو قلب و روح پر مستولی ہو اور جسم کے بند بند میں زندگی کی آگ ہو۔ اسی تقویٰ نے انھیں بے مثال سادگی پسند، قناعت پیشہ، غیرت مند، خوددار، خاکسار الطبیعت اور بے نفسی و منکسر المزاجی کا پیکر بنا ڈالا تھا۔ اخلاص کس چیز کا نام ہے، بے نفسی کسے کہتے ہیں، خودداری اور قناعت کی تعریف کیا ہے یہ معلوم کرنا ہو تو ابو اللیث مرحوم کی زندگی بتائے گی کہ یہ ہے اخلاص، اسے کہتے ہیں للّٰہیت اور یہ ہے بے نفسی، انکسار اور سادگی کا یہ مفہوم ہے۔ اسی بے مثال زہد و تقویٰ اور زندہ ایمان باللہ کا ثمرہ تھا کہ اس نے انھیں غیر معمولی طور پر بہت زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک بنا دیا تھا۔ ان کے قلب و جگر کو وہ غیر معمولی قوت و حوصلہ بخش دیا تھا کہ ایسے کٹھن ہلا کر رکھ دینے والے لرزہ خیز حالات آئے اور آتے رہے کہ بڑے بڑے دل گردہ والے گھبرا اٹھیں لیکن یہ مولانا ہی کا جگر اور گردہ تھا کہ وہ ہٹتے نہیں تھے، گھبراتے نہیں تھے۔ ان پر اثر نہیں ہوتا تھا اور ان کے حواس بحال رہتے۔ اسی تقویٰ کی معجز نمائی تھی کہ ان کے اصولوں میں کبھی لچک نہیں پیدا ہوئی اور انھوں نے اپنے لئے جو شاہراہ حیات تجویز کی تھی اسی پر تادم واپسیں چلتے رہے۔ نہ دشمنوں کی مخالفت حائل ہوئی اور نہ غیروں کی دشمنی۔ یہ تقویٰ ہی تھا کہ زندگی کے پر پیچ اور طویل سفر میں نہ جھجکے، نہ ڈرے، اذیت و مصیبت جھیلتے رہے۔ نہ ہمت ہاری اور نہ پشت پھیری۔ ہمیشہ مسلسل، بلا تکان، بغیر رکے، بغیر ستائے بغیر دم لئے، راہ کے کانٹوں کو صاف کرتے، صعوبتوں کا مقابلہ کرتے اور باطل پر یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور پیش قدمی کرتے رہے۔ نہ ترغیبات زنجیر پا ثابت ہوئیں اور نہ ترہیبات راہ کا روڑا بن سکیں۔

یہ تقویٰ ہی تھا کہ مولانا کسی مخصوص خول میں بند نہیں ہوئے۔ تحزب اور گروہی عصبیت سے اوپر اٹھ کر دین اور اہل دین سب کے لئے خیر خواہ رہے۔ ہر مکتب فکر اور ہر مسلک خیال کے لوگوں

ط مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کی یہ گواہی ہے جو انھوں نے ساتھ لئے رہتے تک سے دی۔

سے ان کے گہرے اور ذاتی مراسم تھے۔ وہ ہر ایک کی خیر خواہی کرتے اور خوشی و غم میں شریک ہوتے۔ ملک و ملت میں ہونے والے واقعات پر تڑپ اٹھتے۔ ملک و ملت کے لئے جب کوئی مشکل وقت آپڑتا اور سخت معاملہ درپیش ہوتا تو ہم ہی نہیں ملت کے افراد انتظار کرتے کہ مولانا ابواللیث اصلاحی کا کیا موقف ہے ان کا کیا اشارہ اور کیا بیان ہے۔ اس سے لوگوں کو روشنی ملتی۔ دین اور جماعت سے گہرا تعلق، خاطر اور ذاتی نوعیت کے رکھ رکھاؤ کا نتیجہ تھا کہ مولانا کی موت پر سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ اپنے بھی روئے اور وہ بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکے جو ان سے فکر و نظر کا اختلاف رکھتے   اور جماعت کے کٹر مخالفین میں رہے ہیں۔

میں نے کسی کی موت پر اس طرح لوگوں کو روتے اور آنسو بہاتے نہیں دیکھا، جبکہ ان ہندو گئی قبیل خدا کی ان سے ان کا کیا تعلق تھا۔ نہ رشتہ دار تھے اور نہ ہی اس طرح کا کوئی تعلق تھا۔ یہ ہمدردی، عزیزی اور محبت کا مقام ان کی بے لوثی اور خیر خواہی کے علاوہ کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

مولانا مدرسے کے فارغ تھے۔ مدارس کی ضرورت و اہمیت اور ان کے رول پر ان سے بڑھ کر کون واقف ہوگا۔ وہ مدارس کو دین کا قلعہ سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ ان ہی مدارس نے ہندوستان کو اسپین بننے سے بچایا ہے۔ یہ دین و ملت کی آبیاری کے لئے کلیدی اور بنیادی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ نئی نسل کی تیاری کا یہ کام جسے آپ تصنیف رجال کہہ سکتے ہیں دوسرے تمام کاموں سے بڑھ کر ہے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ اساتذہ یکسو ہو کر یہ کام کریں کہ اقامت دین کے لئے بنیادی غذا اور توانائی یہیں سے حاصل ہوگی۔

جامعۃ الفلاح مولانا کی آرزو اور ان کا خواب تھا۔ اول دن سے مولانا کو اس سے جو لگاؤ تھا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ مولانا یہاں کے ہونے والے اتار چڑھاؤ بلکہ نبض کی حرارت اور سانس کی گرمی اور اس کی آمد و شد سے بھی واقف رہنے کی کوشش کرتے۔ وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے اور تقریباً نو سال اس کے ناظم بھی رہے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ مولانا چاند پور تشریف لائیں اور جامعۃ الفلاح کو رونق نہ بخشیں۔ اساتذہ و طلبہ بھی ان کا بے تابانہ انتظار کرتے۔

کہتے ہیں ہندوستان سونے کی چڑیا تھا یہاں کی سرزمین سونا اگلتی تھی انگریز سارا سونا سمیٹ لے گئے۔ میں کہتا ہوں یقیناً یہاں کی سرزمین سونا اگلتی تھی اور اگلتی ہے لیکن انگریز کوئی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اس سونے کو نگل سکے، یا ڈاکہ ڈال سکے۔ یہ سونا اپنی نوعیت کا مخصوص سونا ہے جسے نہ چرایا جا سکتا ہے نہ چھینا جا سکتا ہے۔ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ ہوں یا اسماعیل شہید اور احمد شہید، مولانا تھانوی، شبیر احمد عثمانی، مولانا مودودی علامہ اقبال، ان میں کون کس سونے سے کم ہے۔ اعظم گڑھ کی سرزمین تو اس معاملہ میں بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے شبلیؒ[1]، فراہیؒ[2]، امین احسنؒ[3]، اختر احسنؒ[4]، جلیل احسنؒ[5]، صدر الدینؒ[6]، عبد الرحمٰنؒ[7] اور ابواللیث اصلاحی۔ ان میں کا ایک ایک آدمی اتنا قیمتی اور تابناک ہے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں دنیا بھر کے سونے چاندی اور جواہرات رکھ دیئے جائیں اور دوسرے میں ان میں کا کوئی ایک فرد بھی رکھ دے تو یہ پلڑا جھک جائے گا بلکہ ہیرے جواہرات سے ان کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ ملک اس معاملہ میں یقیناً بڑا خوش قسمت ہے۔۔۔۔

"میرے عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے" بالکل صحیح ہے۔ اگر لوگ اپنے علاقوں کی عظمت و بلندی اور شخصیات و رجال کار کا تذکرہ کریں کہ ہمارے یہاں یہ ہیں وہ ہیں تو ہم بھی محمد، ابواللیث جیسے لوگوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس اپنے محل و گھر موجود ہیں تو پھر کوئی غم نہیں اگر ہم بے تیغ بھی ہیں۔ ہم نے گلشن میں چشمے جاری کر سکتے اور آسمانوں سے تارے توڑ کر لا سکتے ہیں۔ قوموں کی زندگی، مال و دولت کی فراوانی، اسباب و وسائل کی بہتات

---

[1] مراد مولانا شبلی: شبلی نعمانی صاحب سیرۃ النبی، بندول اعظم گڑھ، شبلی نعمانی، چیرا جیراج پور اعظم گڑھ شبلی نگر پھریہا اعظم گڑھ [2] علامہ حمید الدین فراہی صاحب تفسیر نظام القرآن پھریہا اعظم گڑھ [3] مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تدبر قرآن، بمہور، اعظم گڑھ [4] مولانا اختر احسن اصلاحی سیدھا سلطانپور [5] مولانا جلیل احسن ندوی، سابق استاذ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ [6] مولانا صدر الدین اصلاحی، پھولپور، اعظم گڑھ [7] مولانا عبد الرحمٰن صاحب تحفۃ الاحوذی، مبارک پور، اعظم گڑھ۔

مطالعہ حدیث

مولانا محمد طاہر عمری
استاد جامعۃ الفلاح

ایمان کی مٹھاس

عن انس رضی اللہ عنہ	ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے
قال قال رسول اللہ صلی	روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ علیہ وسلم: ثلاث	نے فرمایا: تین خصلتیں جس شخص کے اندر
من کن فیہ وجد حلاوۃ	ہوں وہ ایمان کی لذت پا گیا، یہ کہ اللہ اور
الایمان: ان یکون اللہ	اس کا رسول اس کے نزدیک سب سے زیادہ
کما یکرہ ان یقذف فی	محبوب ہو اور وہ صرف اللہ ہی کے لئے
النار (متفق علیہ)	کسی شخص سے محبت کرتا ہو اور کفر کی طرف

ورسولہ احب الیہ مما سواہما وان یحب المرء لا یحبہ الا للہ وان یکرہ ان یعود فی الکفر

پلٹنا اسی طرح سے ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈالا جانا پسند کرتا ہے۔

شرح:- "حلاوۃ الایمان" سے مراد وہ روحانی سکون اور قلبی لذت ہے جو اللہ کی اطاعت کے راستے پر چلتے ہوئے حاصل ہوتی ہے۔ امام نووی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "استلذاذ الطاعات وتحمل المشاق فی رضی اللہ عزوجل ورسولہ وایثار ذلک علی عرض الدنیا" یعنی حلاوت ایمانی طاعات میں لذت محسوس کرنے، اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی خاطر مشقتیں برداشت کرنے اور رضائے الٰہی کے حصول کو دنیا کے مال و متاع پر ترجیح دینے کا نام ہے۔ اس حدیث میں جن تین فضائل کا ذکر ہے ان کی مختصر توضیح نیچے کی جاتی ہے۔

پہلی خصلت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہو۔ ایک مومن کو اس بات کا احساس ہو تو لیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات کے نیچے دبا ہوا ہے، اس

اچھی اور عمدہ صحت، مال و دولت، ڈگریوں اور ملازمتوں کے حصول کی رہین منت نہیں ہوا کرتی۔ قوموں کی زندگی اور ان کی عظمت جسمانی بھی اور دینی و تہذیبی بھی ان شیروں سے وابستہ ہوتی ہے جو اپنے آپ کو دین و ملت کے لئے قربان کرنا اور وقف کرنا جانتے ہوں، جو صحت کی پروا نہ کریں، جو اپنے کو گھلا اور پگھلا دیں، جو اپنے آپ کو نگلا ہوا کر دیں۔ پھر کوئی قوم آنکھ دکھا نہیں سکتی۔ مقابلہ کی تاب لا نہیں سکتی۔ سائنسی و مادی ترقی اور فنی توانائی سے مرعوب نہیں کر سکتی۔ ہم سے ہمارا لال قلعہ چھین سکتی ہے، ہمیں ہمارے قطب مینار اور تاج محل سے محروم کر سکتی ہے ہمیں کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ ہم ایک اسلامی ریاست کے لئے دس لال قلعے قربان کر سکتے اور دس تاج محل کو پاسنگ حقارت سے ٹھکرا سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی غم نہیں، کوئی خطرہ نہیں۔

الٰہ العالمین مرحوم کی مغفرت فرما، ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ مولیٰ! انھوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا اور دنیا سے بہت کم لیا۔ انھوں نے اپنے لئے کوئی شاندار گھر تک نہیں بنایا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو تیز چلتے ہوئے دماغ اور تیری عطا کی ہوئی صلاحیت اور تیرے بخشے ہوئے وسائل سے کام لے کر بہت کچھ بنا سکتے تھے۔ مولیٰ! انھوں نے دین کی خاطر اپنے لئے کچھ نہیں کیا۔ انھوں نے دنیا سے اور دولت سے اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو بہت دور رکھا۔ خدایا! ان کے پاس ایک کھپریل کا گھر تھا۔ اور وہ بھی بری طرح ٹپکتا تھا۔ آقا! انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ ابھی ہمیں ان کی ضرورت تھی تو نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ الٰہ العالمین! تو غیب سے ہمارے لئے سامان مہیا کر اور ان کا نعم البدل عطا فرما۔

اسے ضرور پڑھئے

۱۔ جن لوگوں کا سالانہ زر تعاون ختم ہو چکا ہے ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنا زر تعاون جلد ارسال فرما دیں۔ کسی وجہ سے فوراً نہ بھیج سکیں تو خط لکھیں بصورت دیگر ان کے نام رسالہ مزید جاری رکھنے سے ہم معذور ہوں گے۔

(ادارہ)

احساس و شعور کی وجہ سے مومن کا دل رب العالمین کے تئیں تشکر و امتنان کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہدایت کی نعمت ہے جس کے ذریعے دنیا کی زندگی بھی سنورتی ہے اور آخرت کی کامرانی بھی اسی سے وابستہ ہے اور یہ نعمت ہدایت اللہ کی جانب سے اس کے رسول کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے رسول کی محبت سے بھی مومن کا دل لبریز ہوتا ہے۔ اس محبت کی علامت خدا اور اس کے رسول کی مخلصانہ اور والہانہ اطاعت ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

ومحبة العبد ربه سبحانه	"بندے کی رب العالمین سے محبت
وتعالى بفعل طاعته وترك	یہ ہے کہ اس کی اطاعت کرے اور اس کی
مخالفته، وكذلك محبة الرسول	نافرمانی سے بچے اور یہی رسول سے محبت
صلى الله عليه وسلم — ودليل	کا تقاضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت
محبة الله اتباع الرسول (قل	کی دلیل اتباع رسول ہے جیسا کہ
إن كنتم تحبون الله فاتبعوني	اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہہ دو اگر تم اللہ
يحببكم الله)	سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ
	کے محبوب ہو جاؤ گے۔

دوسری خصلت یہ ہے کہ اللہ ہی کی خاطر کسی انسان سے محبت ہو۔ یہ خود محبت الٰہی کا تقاضہ ہے کیونکہ محبوب کی پسندیدہ چیز سے محبت بھی لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں سے محبت کرتا ہے۔ لہذا ایسے بندوں سے محبت کا تعلق بھی ایمان باللہ کا لازمی تقاضہ ہے۔ پھر اس محبت کی اہمیت ایک اور پہلو سے بھی ہے۔ ایک بندہ جب ہر طرف سے کٹ کر اور یکسو ہو کر اللہ تعالیٰ کی مخلصانہ اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ بہت بڑی قربانی دیتا ہے۔ اور کتنے ہی تعلقات کی گردن پر چھری چلا دیتا ہے۔ اب اگر اسے اپنے اہل ایمان بھائیوں کی مخلصانہ محبت حاصل نہ ہو تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔

تیسری خصلت جس کا ذکر اس حدیث میں ہے وہ یہ ہے کہ بندہ کفر کی طرف پلٹنا اسے

طرح ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈالا جانا ناپسند کرتا ہے۔ امام بخاری نے حدیث کے اس ٹکڑے کو کتاب الادب میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"وحتى أن يقذف في النار	یعنی کفر کی طرف پلٹنے کے مقابلہ میں
أحب إليه من أن	آگ میں ڈالا جانا اسے پسند ہو۔
يرجع إلى الكفر بعد إذ	
أنقذه الله منه"	

ظاہر ہے ایمان کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد کوئی شخص کسی قیمت پر کفر کی طرف پلٹنا گوارا نہیں کر سکتا۔ آتش کی بھٹیوں میں اسے تپایا جائے، ظلم و ستم کی چکی میں اسے پیسا جائے تب بھی اس کی زبان سے بلال حبشیؓ کی طرح "احد احد" کا نعرہ دلنواز ہی نکلے گا۔

اس حدیث پر غور کرنے سے حسب ذیل نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ایک مومن کے دل میں سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہونی چاہئیے۔

۲۔ ایمان کے اندر ایک لذت ہوتی ہے جسے وہ شخص محسوس کرتا ہے جو مذکورہ تینوں خصائل سے متصف ہو۔

۳۔ اللہ سے محبت کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ انسانوں سے محبت یا عداوت کی بنیاد اللہ کی رضا ہی کو بنایا جائے۔

۴۔ مومن کے نزدیک آگ میں ڈالا جانا کفر کی طرف پلٹنے کے مقابلے میں قابل ترجیح چیز ہونی چاہئیے۔ اور حالات کی تمام سختیوں کے باوجود اسے دین پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا چاہئیے۔

حضرت صُہیب رُومی رضی اللہ عنہ

مولانا اقبال احمد صاحب قاسمی اسلام گنج

ہم میں سے ہر مسلمان حضرت صہیب رومیؓ کے نام سے واقف اور ان کی زندگی کے حالات سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ ہے۔ البتہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو شاید یہ بات کا علم نہ ہو کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ رومی نہیں، خالصاً عربی النسل تھے۔ ان کے والد کا تعلق قبیلۂ بنو نمیر اور ان کی والدہ کا تعلق قبیلۂ بنو تمیم سے تھا۔ حضرت صہیبؓ روم کی طرف کیسے منسوب ہوئے، اس پس منظر میں ایک ناقابلِ فراموش کہانی ہے جو تاریخ کے حافظے میں ہمیشہ محفوظ رہے گی اور اس کے صفحات برابر اس کو بیان کرتے رہیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً دو دہائی پہلے کی بات ہے کہ کسریٰ شاہ ایران کی طرف سے سنان بن مالک "ابلہ" کا گورنر تھا۔ وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت اپنے بچے صہیب سے کرتا تھا جس کی عمر اس وقت پانچ سال سے متجاوز نہ تھی۔

صہیب کا چہرہ روشن و تابناک اور اس کے بالوں کا رنگ سرخی مائل تھا۔ چہرے بشرے سے تازگی و شادابی جھلکتی تھی اور اس کی روشن آنکھیں ذہانت و نجابت کی آئینہ دار تھیں۔ اس کے علاوہ وہ نہایت چست و چالاک اور پاک نفس و نیک سیرت بچہ تھا۔ اس کو دیکھتے ہی باپ کا دل باغ باغ ہو جاتا اور دل سے حکمرانی کی ساری پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں۔

ایک دفعہ صہیب کی ماں اپنے خورد سال بچے اور خدام و ملازمین کی ایک جماعت کے ساتھ آرام اور سیر و تفریح کے ارادے سے عراق کی ایک بستی "ثنی" کے لیے روانہ ہوئی۔ اس بستی پر رومی فوج کے ایک دستے نے اچانک حملہ کر دیا۔ اس کے محافظوں کو قتل کر کے مال و اسباب لوٹ لیا اور بچوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ ان گرفتار شدگان میں صہیب بھی تھا۔

صہیب کو بلاد روم میں غلاموں کی ایک منڈی میں لے جا کر فروخت کر دیا گیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ اور ایک آقا کی خدمت سے دوسرے آقا کی خدمت میں منتقل ہوتا رہا۔ اس معاملہ میں اس کی حالت "ان ہزاروں لونڈی غلاموں سے مختلف نہ تھی جن سے سرزمین روم کے حکمرانوں اور اس کے رئیسوں کے محلات بھرے ہوئے تھے۔ اس سے صہیب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ رومی معاشرہ کے اندر گھس کر اور اس کی تہ میں پہنچ کر اس کے اندرونی حالات سے واقف ہو سکے اور اس کے اندر پائے جانے والے گھناؤنے عیوب سے براہ راست آگاہی حاصل کر سکے۔ چنانچہ اس نے ان تمام فواحش و منکرات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جنھوں نے ان محلات میں آشیانے بنا رکھے تھے۔ اور اس نے اپنے کانوں سے ظلم و ستم کی وہ ساری داستانیں سنیں جو وہاں دہرائی جاتی تھیں۔ چنانچہ یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد صہیب کو اس معاشرہ سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے دل میں سوچتا تھا کہ اس قسم کا گندہ معاشرہ کسی زبردست طوفان کے بغیر پاک نہیں ہو سکتا۔

اس کے باوجود صہیب نے روم کے علاقے میں نشوونما پائی اور اس کے باشندوں کے درمیان پل بڑھ کر جوان ہوا۔ اور اس کے باوجود کہ وہ عربی زبان کو بھول گیا تھا یا تقریباً بھول چکا تھا، یہ بات اس کے دل سے ایک لمحہ کے لیے فراموش نہیں ہوئی تھی کہ وہ عربی النسل اور ابنائے صحرا میں سے ہے۔ وہ ہر آن اس مبارک دن کے شوق و انتظار میں رہتا تھا جس روز وہ غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دے گا اور اپنے قبیلے سے جا ملے گا۔ اس نے ایک نصرانی کاہن کو اپنے ایک آقا سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "وہ وقت اب قریب آ گیا ہے جب جزیرۂ عرب کے شہر مکہ سے ایک نبی ظاہر ہوگا جو عیسیٰ ابن مریمؑ کی رسالت کی تصدیق کرے گا اور

اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کے جاودانی نور سے روشناس کرائے گا۔ اس بات کے تذکرے نے تازیانے کا کام کیا اور اس کے مقدس انتظار کو مزید تیز کر دیا۔

پھر خوش قسمتی سے صہیب کو ایک سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے آقاؤں کی غلامی کے بندھن کو توڑ کر بھاگ نکلا اور اس نے سیدھے نبی منتظر کی جائے بعثت مرکز عرب ام القریٰ مکہ مکرمہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گیا۔ اس کی زبان میں پائی جانے والی لکنت اور اس کے سرخ بالوں کی وجہ سے لوگ اسے صہیب رومی کہنے لگے۔ اس نے مکے کے ایک رئیس عبداللہ بن جدعان سے حلیفانہ روابط قائم کر لئے اور تجارت کے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ اور اس میں اس نے کافی دولت کمائی۔ صہیب اپنی کاروباری مصروفیات اور تجارتی سرگرمیوں کے باوجود اس نصرانی کاہن کی بات بھولا نہیں تھا۔ جب بھی اسے اس کی بات کا خیال آتا، وہ بڑی حسرت کے ساتھ اپنے دل سے یہ سوال کرتا۔

"وہ واقعہ کب پیش آئے گا؟"

اور پھر تھوڑی ہی مدت کے بعد اس سوال کا مجسم جواب اس کے سامنے تھا۔

ایک روز صہیب اپنے ایک تجارتی سفر سے واپس مکہ پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا ہے اور وہ لوگوں کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت اور عدل و احسان کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اور فواحش و منکرات سے منع کر رہے ہیں۔

"یہ وہی تو نہیں ہیں جنہیں لوگ 'امین' کے لقب سے پکارتے ہیں؟" صہیب نے دریافت کیا۔

"ہاں وہی ہیں۔" جواب دینے والے نے کہا۔

"اس وقت وہ کہاں ملیں گے؟" صہیب نے پر شوق لہجے میں سوال کیا۔

ان کو بتایا گیا کہ وہ اس وقت ارقم بن ابی ارقم کے مکان میں ہوں گے۔ جو کوہ صفا کے قریب ہے ...... لیکن اگر تم کو ان سے ملنا ہے تو ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں قریش کے

کسی آدمی کی نظر تمہارے اوپر پڑ جائے۔ اگر انہوں نے تم کو ان سے ملتے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے اور تم کو سخت اذیت پہنچائیں گے۔ یہاں تک کہ تم ایک غریب الوطن ہو۔ یہاں نہ تو تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے جو تمہاری حمایت کرے گا، نہ تمہارا قبیلہ و خاندان ہے جو تمہاری نصرت کے لئے اٹھ کھڑا ہو گا۔"

صہیب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے دار ارقم کی سمت چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو دروازے پر عمار بن یاسر کو پایا، وہ انہیں پہلے سے جانتے تھے۔ پہلے تو تھوڑی دیر تک تردد و تذبذب میں مبتلا رہے لیکن پھر ان کے قریب پہنچے اور کہا۔

"عمار! آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"اور آپ کس مقصد سے آئے ہیں؟" عمار نے کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"میں اس شخص (ﷺ) کے پاس جانا چاہتا ہوں تاکہ ان کی باتیں سنوں"

صہیب نے جواب دیا۔

"میں بھی تو اسی خیال سے آیا ہوں۔" عمار نے کہا۔

"تب ٹھیک ہے" صہیب نے کہا۔ "آؤ اللہ کا نام لے کر ایک ساتھ چلیں۔"

صہیب بن سنان رومی اور عمار بن یاسر دونوں ایک ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو بڑے غور اور توجہ سے سنا۔ پیارے رسول کی وہ پیاری پیاری باتیں کانوں کے راستے سیدھے ان کے دلوں میں اتر گئیں اور دونوں کے دل نور ایمان سے جگمگا اٹھے۔ انہوں نے فوراً اپنے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا دیئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر دین اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور دن بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہ کر آپ کے چشمۂ رحمت سے اچھی طرح سیراب اور آپ کے اخلاق و سیرت سے بھرپور استفادہ کرتے رہے۔ جب رات کی تاریکی ماحول پر مسلط ہو گئی اور زندگی کے ہنگامے خاموشی میں تبدیل ہو گئے تو دونوں تاریکی کے پردے میں آپ کے پاس سے نکلے۔ اور اپنے اپنے

وہ دونوں اپنے سینوں میں وہ روشنی لئے ہوئے تھے جو ساری دنیا کو منور کرنے کے لئے کافی تھی۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت سمیہ اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم وغیرہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ قریش کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کیں۔ انھوں نے اہل مکہ کی طرف سے ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں کہ اگر وہ پہاڑ پر نازل ہو جاتیں تو اسے بھی پاش پاش کر دیتیں لیکن انھوں نے راہ خدا میں پیش آنے والے ان تمام آلام و مصائب کو نہایت خندہ پیشانی اور صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا کیونکہ انھیں معلوم تھا جنت کی راہیں مکارہ اور تکلیف دہ باتوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو مدینے کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت صہیبؓ نے اسی وقت اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ ہجرت کا یہ سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں کریں گے لیکن قریش کو کسی طرح ان کے اس ارادے کی بھنک مل گئی اور انھوں نے ان کو اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے زبردستی روک دیا۔ اور ان کی نگرانی کا سخت انتظام کر دیا تاکہ وہ تجارت سے کمائی ہوئی دولت اپنے ساتھ لے کر ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی ہجرت کے بعد حضرت صہیبؓ کسی مناسب موقع کی تاک میں رہتے تھے جس سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیں مگر انھیں اس میں کامیابی نہیں حاصل ہو سکی کیونکہ ان کی نگرانی کرنے والے ہر وقت ان کی طرف سے ہوشیار اور چوکنے رہتے تھے۔ اس لئے اب ان کے پاس سوائے اس کے دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لئے کسی حیلے کا سہارا لیں۔ چنانچہ ایک سرد رات میں انھوں نے پاخانے کے بہانے بار بار باہر آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ پاخانے سے آکر فوراً ہی اس کے لئے واپس لوٹ جاتے تھے۔ وہ نگرانی کرنے والوں کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ انھیں بار بار رفع حاجت کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر ان کی نگرانی کرنے والوں میں سے ایک نے کہا:

"خوش ہو جاؤ۔ لات و عزیٰ نے اس کو دست میں مبتلا کر دیا ہے۔" پھر وہ مطمئن ہو کر

اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے اور اپنے آپ کو میٹھی نیند کی آغوش میں ڈال دیا۔

اس موقع کو غنیمت جان کر حضرت صہیبؓ ان کے درمیان سے دھیرے سے نکلے اور مدینہ کی طرف چل پڑے لیکن ان کو روانہ ہوئے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ان کی نگرانی کرنے والوں کو ان کے نکل جانے کا پتہ چل گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے اچھل کر اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ان کے پیچھے انھیں سرپٹ چھوڑ دیا تاکہ جلد از جلد ان کو پکڑ لیں۔ جب حضرت صہیبؓ کو محسوس ہوا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے تو وہ ایک ٹیلے پر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ترکش سے تیر نکال کر زمین پر پھیلا دیئے اور کمان کو تانت چڑھاتے ہوئے بولے.....

"قریش کے لوگو! خدا کی قسم تم لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک بہترین تیر انداز اور بے مثل نشانہ باز ہوں اور میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ واللہ تم لوگ اس وقت تک میرے قریب بھی نہیں پہنچ سکتے جب تک تمہارے ہر تیر سے تم میں سے ایک آدمی کو قتل نہ کر دوں۔ پھر میں اس وقت تک تلوار سے تمہارا مقابلہ کرتا رہوں گا جب تک اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔"

یہ سن کر ان میں سے ایک نے کہا:

"خدا کی قسم ہم تم کو اپنی جان اور مال دونوں چیزیں بچا کر نہیں لے جانے دیں گے تم مکہ میں ایک مفلس کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہاں رہ کر تم نے کافی دولت جمع کر لی ہے"

"اگر میں اپنا مال تمہارے لئے چھوڑ دوں تو کیا تم میرا راستہ چھوڑ دو گے؟" حضرت صہیبؓ نے پوچھا۔

"ہاں۔" انھوں نے کہا۔

تب حضرت صہیبؓ نے ان کو اپنے گھر میں اس جگہ کی نشاندہی فرما دی جہاں انھوں نے مال رکھا تھا۔ اور انھوں نے ان کا راستہ چھوڑ دیا اور جا کر بتائی ہوئی جگہ سے مال لے لیا۔

اس کے بعد حضرت صہیبؓ تیز رفتاری کے ساتھ مدینہ کی سمت چل پڑے۔ وہ اپنے دین کو کافروں سے بچا کر اللہ کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ انھیں اپنے اس

ان کے جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا جس کے کمانے میں انھوں نے بہترین صلاحیتیں صرف کی تھیں۔ دوران سفر جب کبھی ان کو تکان محسوس ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا شوق ان کے لیے مہمیز کا کام دیتا اور ان کی بچی کھچی توانائی کو جگاتی اور وہ آگے بڑھتے رہتے۔ چلتے چلتے جب وہ قبا پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ آپ نے ان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

رَبِحَ الْبَيْعُ يَا أَبَا يَحْيَىٰ رَبِحَ الْبَيْعُ "ابو یحییٰ، یہ تجارت بہت نفع بخش رہی۔"

آپ نے اس فقرے کو تین بار دہرایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلنے والی اس خوش خبری کو سن کر ان کا چہرہ فرط مسرت سے کھل گیا، اور انھوں نے عرض کیا۔

"اللہ کے رسولؐ! مجھ سے پہلے آپ کی خدمت میں کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے جو آپ کو اس بات کی خبر دیتا۔ خدا کی قسم آپ کو یہ بات جبرئیلؑ کے سوا کسی نے نہیں بتائی ہے۔"

یقیناً حضرت صہیبؓ کی بیع کامیاب رہی اور وحی آسمانی نے اس کی تصدیق کر دی۔ اور حضرت جبرئیلؑ نے اس کی شہادت دی۔ جیسا کہ حضرت صہیبؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ	انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے۔ اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔
(البقرۃ ۲۰۷)	

خورشید احمد ندیم

مولانا مودودی کا تصورِ حدیث و سنت*

اللہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دین اس امت کو منتقل ہوا ہے، وہ تین اجزا پر مشتمل ہے: قرآن مجید، سنت ثابتہ اور حدیث۔ قرآن مجید کے بارے میں امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، جو اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور جو پورے اہتمام کے ساتھ اس امت میں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آج بھی اسی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے جس صورت میں یہ دورِ صحابہ میں تھا۔ یہی مقام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو حاصل ہے جو عملی تواتر اور دوسرے ذرائع سے ہر دور میں محفوظ رہی۔ یہ اسی اہتمام کی بنا پر ہے کہ قرآن مجید اور سنت ثابتہ سے حاصل ہونے والے علم کی حیثیت، دین اسلام میں علم یقین کی ہے۔ حدیث کا معاملہ البتہ قرآن مجید اور سنت سے قدرے مختلف ہے۔ روایت حدیث میں احتیاط کا وہ معیار برقرار نہ رکھا جا سکا جس کا مظاہرہ قرآن مجید اور سنت ثابتہ کے باب میں نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر ہر دور میں اس امت کے جلیل القدر محدثین نے تحقیق کے کئی مراحل سے گزارنے کے بعد کسی روایت کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا۔ احادیث کا یہ ذخیرہ زیادہ تر اخبار آحاد پر مشتمل ہے اور ان میں موجود علم کو ظن ہی کی حیثیت حاصل ہے۔

حدیث و سنت میں فرق، اخبار آحاد کی حجیت، صحت روایت کے لیے محض سند کو بنیاد قرار دینا اور اسی طرح کے دوسرے مسائل پر امت مسلمہ میں اختلاف رہا ہے۔ ایک گروہ سنت اور حدیث

* اشراق، مارچ ۱۹۹۰ء

میں کسی فرق کا قائل نہیں۔ وہ خبرِ واحد سے ملنے والی معلومات کو قرآن اور سنّت کی طرح حجّت قرار دیتا ہے اور ان کے نزدیک کسی روایت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنے کے لیے سند کی صحت کفایت کرتی ہے۔ اس کے برخلاف امت کا دوسرا طبقہ حدیث اور سنّت میں قطعی فرق ملحوظ رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی قول یا فعل کو اللہ کے رسول سے منسوب کرنے کے لیے اسناد کے علاوہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ روایت کی اساس قرآنِ مجید، سنّتِ ثابتہ اور عقل و فطرت کے مسلّمات میں پائی جاتی ہو اور وہ کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہو۔

عصرِ حاضر کے جلیل القدر عالمِ دین مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریروں میں کئی مقامات پر اس موضوع سے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کی کتب و رسائل کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ہی طبقے کی رائے کو درست قرار دیتے ہیں۔

حدیث و سنّت کے اصولی فرق کو واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنّت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضور کے قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا، جس کی تفصیلات معتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں اور بعد کی نسلوں نے اگلی نسلوں میں اس پر عمل درآمد ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔"[1]

لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اس موضوع پر وضاحت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں:

"سنّت اس طریقے کو کہتے ہیں جسے حضور نے خود اختیار فرمایا اور امت میں اسے جاری کیا۔ سنّت کے لفظ کا اطلاق ان امورِ واقعی پر ہوتا ہے جو حضور سے ثابت ہے۔ اس کے برعکس حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے کیا کیا اور کس چیز کو کرنے کا حکم دیا۔ اس لحاظ سے حضور کی پوری زندگی کا طور طریقہ سنّت ہے۔ آپ نے زندگی کے مختلف

۱؎ تفہیم القرآن جلد ششم ص ۳۰۰

شعبوں اخلاق، تہذیب، عبادات، معاملات کے متعلق جو کچھ ہدایات دی ہیں انھیں آپ کی سنّت کہا جائے گا۔ حدیث کا اطلاق متعدد چیزوں پر ہوتا ہے۔ علمِ حدیث کو بھی حدیث کہتے ہیں، احادیث کے مجموعے کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ ایک ایک حدیث کو بھی حدیث کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ حدیث کے مختلف مجموعوں کو بھی حدیث کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ احادیث کے تمام مجموعوں کا حکم یکساں نہیں ہو سکتا اور کوئی ہوشمند آدمی یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ سارے ذخیرۂ احادیث میں جو کچھ درج ہے اسے بلا جانچ پڑتال سنّت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔"[1]

حدیث سے حاصل شدہ علم کی حیثیت اگر ظنی ہے تو کیا یہ علم کفر اور ایمان کا مدار ہو سکتا ہے؟ یعنی اگر کسی معاملے کا ذکر قرآن مجید میں نہیں اور سنّتِ ثابتہ بھی اس کے بارے میں خاموش ہے تو کیا محض حدیث کی بنیاد پر اسے کفر یا ایمان قرار دیا جا سکتا ہے؟ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جن چیزوں پر کفر اور اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے، انھیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے، وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی[2] لہٰذا جو مسئلہ بھی دین میں یہ نوعیت رکھتا ہو تو اس کا ثبوت لازماً قرآن ہی میں ملنا چاہیے۔ محض حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جا سکتی جسے مدارِ کفر و ایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں، جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علمِ یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو، انھیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں فرمائے۔ اللہ کا رسول انھیں اپنے

۱؎ مولانا مودودی کی تقاریر، حصہ دوم ثبوت صلوت

۲؎ سورۂ اللیل ۹۲: ۱۲ (راہ بتانا ہمارے ذمہ ہے)

پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیے گئے ہوں"۔[1]

مولانا کی اس تحریر کی بابت جب ان سے استفسار کیا گیا تو انھوں نے جواباً لکھا:

"... ما بہ الکفر و الایمان اگر ہو سکتے ہیں تو صرف وہ امور ہو سکتے ہیں جو کسی یقینی ذریعہ علم سے ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے ہیں، اور وہ ذریعہ یا تو قرآن ہے یا پھر نقل متواتر جس کی تشریح امام سرخسی نے واضح طور پر بیان کر دی ہے۔[2] باقی جو چیزیں اخبار آحاد یا روایات مشہورہ سے نقل ہوئی ہیں، وہ اپنی اپنی دلیل کی قوت کے مطابق اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی یہ اہمیت نہیں ہے کہ اسے ایمانیات میں داخل کر دیا جائے۔ اور اس کے نہ ماننے والے کو کافر ٹھہرا دیا جائے"۔[3]

مولانا مرحوم کی ان تحریروں سے یہ بات اظہر من الشمس ہو کر سامنے آتی ہے کہ مطلق حدیث کی بنیاد پر کوئی بنیادی دینی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کسی امر کو دین قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ میں موجود ہو۔

سند کے بارے میں بھی ہمارے ہاں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ اہل حدیث علماء کا یہ موقف ہے کہ اگر محدثین کسی روایت کو سند کے اعتبار سے صحیح قرار دے دیں، تو پھر اس کا انکار قول رسول کا انکار ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مطلق سند کی صحت اس بات کے لیے کافی نہیں کہ ایک روایت کو اللہ کے رسول کا فرمان قرار دیا جائے۔ چنانچہ سند کے لحاظ سے صحیح روایت، اگر قرآن کے مطابق نہیں تو قبول نہیں کی جائے گی۔

"کوئی روایت خواہ اس کی روایت آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو ایسی صورت میں

[1] رسائل و مسائل، حصہ اول، ص ۵۰، ۵۱

[2] اپنے اس مضمون میں مولانا نے فقہ حنفی کے امام علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "اصول السرخسی" کے حوالے سے خبر واحد و خبر متواتر کے بارے میں، ان کی رائے درج کی ہے، جو ان کے مذکورہ بالا موقف کی تائید کرتی ہے۔

[3] رسائل و مسائل، حصہ سوم، ص ۹۰

قابل قبول نہیں ہو سکتی جب کہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب، ہر چیز اسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو"۔[1]

اسی طرح سند کے اعتبار سے صحیح روایت اگر عقل عام کے خلاف ہے تو اسے بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ بخاری و مسلم اور دوسری کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ روایت موجود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک دن قسم کھائی کہ میں ایک رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے ان شاء اللہ نہیں کہا۔ نتیجتاً ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا اور وہ بھی ادھورا، جسے لا کر دائی نے حضرت سلیمان کی کرسی پر ڈال دیا۔ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی رقم طراز ہیں:

"جہاں تک سند کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے اور باعتبار روایت ان کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہوگی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے بلکہ آپ نے غالباً یہود کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطور مثال فرمایا ہوگا اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہوگئی کہ اس بات کا حضور خود واقعہ کے طور پر بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی روایات کو محض صحت سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے"۔[2]

مولانا کے نزدیک کسی روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنے کے لیے جن چیزوں کا لحاظ ضروری ہے، سند ان میں سے ایک ہے۔ اس لیے سند تنہا کسی حدیث کے صحیح ہونے کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک سند کسی حدیث کی صحت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ نہیں ہے، بلکہ وہ ان ذرائع میں سے ایک ہے، جن سے کسی روایت کے حدیث رسول ہونے کا ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ متن پر غور کیا جائے۔ قرآن و سنت

[1] تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۲۴۳

[2] تفہیم القرآن، جلد چہارم، ص ۳۳۰

کے مجموعۂ علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے، اس کا لحاظ بھی کیا جائے، اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملے سے متعلق ہے، اس معاملے میں کوئی اور نوع سے جو سنت ثابتہ ہمیں معلوم ہو اس پر بھی نظر ڈالی جائے ۔ علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر ہم کسی روایت کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دینا درست نہیں سمجھتے۔"[1]

انہی اصولوں کے پیش نظر مولانا نے کئی ایسی روایات کو قبول نہیں کیا جو سند کے لحاظ سے درست ہونے کے باوجود دین کے مجموعی تصور یا عقل عام کے خلاف ہیں، ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کذب ثلاثہ، آیۂ رجم اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ستر بیویوں کے پاس جانا جیسی روایات شامل ہیں جو موطا امام مالک، بخاری اور مسلم جیسی مستند کتب حدیث میں نقل ہوئی ہیں۔

محدثین امت نے احادیث کی جرح و تعدیل کے باب میں جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، ایک غیر متعصب آدمی کے پاس ان کی عظیم خدمات کے اعتراف کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن اس اعتراف کے باوجود کیا اس باب میں ان بزرگوں کی رائے حرف آخر ہے۔ کیا احادیث کی تحقیق و تنقیح کا کام اگلے محققین پر ختم ہو گیا ہے۔ مولانا مودودی کے نزدیک ان سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"احادیث کی تنقید و تحقیق و ترتیب کا جو کام ابتدائی چار صدیوں میں ہو چکا ہے وہ اگرچہ نہایت قابل قدر ہے مگر کافی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ اس سلسلے میں کرنا باقی ہے۔ رہی یہ بات کہ علماء نے پھر یہ کام کیوں نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن علماء نے چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کو حرام قرار دیا ہو ان کے متعلق یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھان بین کا کام کیوں نہیں کیا۔"[2]

محدثین کا یہ کام اگر کافی نہیں ہے تو پھر انھوں نے روایت کی تحقیق کے باب میں جو کام کیا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ مولانا مودودی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم، یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لیے جو مواد انھوں نے فراہم کیا

[1] رسائل و مسائل، حصہ اول، ص ۲۳۳

[2] ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۶

ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلام اس میں نہیں، بلکہ اس امر میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرت الٰہی نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے۔ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب ان کو جس بنا پر حاصل ہوتا تھا وہ زیادہ تر روایت کے لحاظ سے تھا، درایت کے لحاظ سے ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر ضمنی ہوتا تھا۔ ان کا اصل موضوع نہ تھا۔ اس لیے فقہاء کے نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ جہاں ان کے کمالات کا بار بار اعتراف کرنا ہوتا ہے وہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ احادیث کے متعلق جو کچھ تحقیقات بھی انھوں نے کی ہیں اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد اور دوسرے بلحاظ تفقہ۔"[1]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حدیث کو مستقل لحاظ سے کبھی موضوع نہیں بنایا۔ اپنے مضامین میں اگر کہیں ضرورت پیدا ہوئی یا کسی استفسار کے جواب میں، جیسا کہ درج بالا سطور سے بھی معلوم ہوتا ہے، انھوں نے اس کے بارے میں اجمالاً کلام کیا ہے۔ لیکن اس اجمال کے باوجود روایت حدیث سے متعلق ان کا نقطۂ نظر آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ واضح رہنی چاہیے کہ مولانا مرحوم یقیناً قرآن مجید کے ساتھ سنت کو بھی ماخذ حقیقی مانتے تھے اور سنت کی اسی حیثیت پر منکرین حدیث کے ساتھ ان کا مشہور تحریری مناظرہ بھی ہوا جو "سنت کی آئینی حیثیت" کے عنوان سے چھپ کر مذہبی ادب کا گراں قدر حصہ ہے۔

[1] تفہیمات، حصہ اول، ص ۲۸۹

زندگی

خوف میں جکڑی ہوئی لگتی ہے گالی زندگی / ڈس رہی ہے یاس کی ناگن یہ کالی زندگی
کوئی ہلچل ہے نہ ہنگامہ نہ کوئی اضطراب / کیا بتائیں کس قدر ہے خالی خالی زندگی
چلچلاتی دھوپ میں دو چار لقموں کے لئے / پھر رہی ہے در بدر بن کر سوالی زندگی
کھیلنا، کھانا، وہ ہنسنا، وہ اچھلنا کودنا / یاد آتی ہے لڑکپن کی نرالی زندگی
زندگی ہنستی ہے بس جہد و عمل سے دوستو! / مسئلے حل کر نہ پائے گی خیالی زندگی
وہ جسے کہتی ہے دنیا محسنِ انسانیت / زندگی تو بس اسی کی تھی مثالی زندگی

اے مجاہد ہے وہی دونوں جہاں میں کامیاب
دین کے سانچے میں ہی جس نے ڈھالی زندگی

موت

پھر کسی تدبیر کو خاطر میں کب لاتی ہے موت / موت کا جب وقت آ جاتا ہے آ جاتی ہے موت
توڑ دیتی ہے نبض کھو جاتی ہے آنکھوں کی ضیا / دل کی دھڑکن بند ہوتی ہے تو کہلاتی ہے موت
صاف کر دیتی ہے پل میں ہستیوں کی بستیاں / قہر کی کروٹ بدلتی ہے غضب ڈھاتی ہے موت
آن واحد میں بجھا کر زندگانی کا چراغ / قبر کے تاریک تہہ خانے میں پہنچاتی ہے موت
اس کے چنگل میں کوئی ذی روح بچ سکتا نہیں / سینکڑوں پردوں کے اندر بھی پہنچ جاتی ہے موت
آدمی کو چاہئے وہ موت کو سوچا کرے / جانے کب کیسے کہاں کس طرح ٹکراتی ہے موت
موت اک زندہ حقیقت اک اٹل قانون ہے / شاہ ہو یا ہو گدا، ہر ایک کو آتی ہے موت

یاد کرتا ہے خدا کو سب سہارے چھوڑ کر
اے مجاہد جب کسی کے سر پہ منڈلاتی ہے موت

عبدالبر اثری فلاحی

توجہ مطلوب ہے

طلبہ اور ان کے سرپرستوں سے

عمر بن عبدالعزیزؒ جنھیں عمر ثانی اور خلیفہ راشد کہا جاتا ہے ان کے بارے میں آتا ہے کہ "ایک مرتبہ وہ نماز میں تاخیر سے پہنچے تو ان کے استاد صالح بن کیسانؒ نے وجہ پوچھی جواب دیا" بال سنوارنے میں دیر ہوگئی" استاد نے کہا کہ بالوں کی آرائش کو نماز پر ترجیح دیتے ہو پھر انھوں نے ان کے والد عبدالعزیزؒ کو اس واقعہ کی خبر کی چنانچہ انھوں نے فوراً ایک آدمی روانہ کیا جس نے آکر پہلے ان کے بال منڈوائے اس کے بعد بات چیت کی۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ ص ۱۱، از عبدالسلام ندوی)

بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن اپنے اندر بہت سی ہدایتیں سمیٹے ہوئے ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر کام کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے اسی میں اسے انجام دینا مطلوب ہوتا ہے دوسرے کام اس مخصوص وقت میں کرنا مناسب ہی نہیں بلکہ قابل مواخذہ ہوتے ہیں گرچہ بجائے خود وہ کام اپنی جگہ پر جائز اور صحیح ہو جیسا کہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کیونکہ بال سنوارنا کوئی ناجائز کام نہیں لیکن نماز جیسی اہم چیز کو مؤخر کر کے یہ کام انجام دینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا تھا اسی لئے انھوں نے گرفت کی اور تربیتی نقطۂ نظر سے یہ گرفت نہایت ضروری تھی۔ عام طور سے طلبہ اور دوسرے لوگ بھی اس سلسلے میں غیر محتاط ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے اس رویے پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور صحیح روش اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں طلبہ کے سرپرستوں کو اپنا بھرپور تعاون

دینا چاہیے اس کے بغیر مطلوبہ کامیابی کا حصول مشکل ہے۔ آپ بھی غور کیجئے جیسے ہی استاد نے حاکم کے سرپرست کو اطلاع دی فوراً دست تعاون بڑھا دیا ایک آدمی بھیجا اور تاکید کی کہ پہلے ان کے بال منڈوانا اس کے بعد دوسری گفتگو کرنا تاکہ "ضرب بالشت و بیجا بالشتی" بال رکھنا اسلام میں معیوب نہیں ہے لیکن بڑے فائدے کے حصول کے لیے چونکہ یہ چیز ضروری تھی اس لئے اس کی خاطر اس کو قربان کرنا ضروری قرار پایا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ عبد العزیزؒ نرمی سے کام لیتے، استاد شاید اقدام نہ کرتے کیونکہ بال سنوارنا کوئی ناجائز کام نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے ایسا کیا آخر اس کی کوئی وجہ تھی۔؟

اب آئیے ذرا ان سرپرستوں کو اپنا سراپا دیکھنے کی زحمت دینا چاہتا ہوں جو حد سے زیادہ نرمی برتتے ہیں، بنیادی باتوں کے سلسلے میں بھی نظر انداز کرتے ہیں۔ بلکہ موقع آجائے تو توجہ دلانے پر الٹے استاد پر برستے ہیں۔ تعاون اور خیر خواہی تو دور کی بات ہے!

خدارا اگر آپ عمر ثانی جیسا بیٹا چاہتے ہیں تو عبد العزیزؒ جیسا باپ بنئے۔ کہ اس کے بغیر یہ چیز ناممکن ہے۔ آپ کا خواب دیرینہ دھرا رہ جائے گا اب دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ آپ کیا کرتے ہیں ......؟

ابن سینا طبیہ کالج بیناپارہ اعظم گڑھ کو حکومت سے ڈگری کورس چلانے کی منظوری

یہ خبر انتہائی پُرمسرت ہے کہ یوپی گورنمنٹ نے اپنے جی۔ او نمبر ۵۶/۸۷/۸۷ - پنچ - ۵ - میڈیکل 2258 مورخہ ۵.۱۰.۸۸ کے ذریعہ ابن سینا طبیہ کالج بیناپارہ اعظم گڑھ۔ یو پی کو عارضی تسلیم کر لیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ڈگری کورس (بی یو ایم ایس) سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن دہلی کے ضابطہ کے مطابق چلانے کی اجازت دے دی ہے۔ حکومت یوپی کے اس اقدام سے بیناپارہ اکیڈمی ایجوکیشنل سوسائٹی کے عہدیداران واراکین، اساتذہ وطلباء اور پورے ضلع کے عوام بالخصوص طبی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے امید ہے کہ اس سے طب یونانی کو مزید فروغ و ترقی کا پورا پورا موقع حاصل ہو سکے گا۔

چوتھی قسط

تحریر: محمد قطب۔ استاذ جامعہ ام القریٰ۔ مکہ
ترجمہ: محمد مسیح الزمان صدیقی۔ مدینہ منورہ

لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم

پھر جب کہ آدمؑ تا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام رسالتوں میں یہ موضوع ثابت شدہ حقیقت ہے تو پھر آخری رسالت کی تو اپنی ایک نوعیت ہے اور اس کی ذمہ داریاں بھی خاص ہیں، جو گزشتہ رسالتوں میں الگ اور ان کے مقابلہ سے دوچند ہیں۔

پچھلی رسالتوں اور ان کے مخاطبین کے بارے میں ارشاد ہے۔

وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلوة ويؤتوا الزكوة وذلك دين القيمة [1]

ترجمہ: "اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔

جب یہ تمام باتیں بھی رسالتوں کے درمیان مشترک ہیں تو آخری رسالت جس کے بعد پھر کوئی رسالت نہیں، جس کے ساتھ آخری رسول کو بھیجا گیا دوسری رسالتوں کے مقابلہ میں اس

[1] سورۃ البینۃ (۵)

کی شان بھی اور ہے اور دوسری رسالتوں کے مقابلہ میں اس کی ذمہ داری بھی دوسری ہے۔

یہ اللہ کی مشیت تھی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور کوئی رسول نہ بھیجے۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین [1]

ترجمہ: "(لوگو!) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔"

اور یہ بھی اللہ کی مشیت تھی کہ اس آخری رسالت کے ساتھ دین مکمل ہو جائے اور یہی تمام انسانیت کا دین ہو۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ [2]

ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا [3]

ترجمہ: اور (اے نبی) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا [4]

(اے محمد) کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں۔

وبعثت الی الناس کافۃ [5] (حدیث)

میں تمام لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

مذکورہ بالا آیات و احادیث کی روشنی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آخری رسالت کی پیروکار آخری امت گذشتہ امتوں کی طرح صرف ایک امر کی مکلف نہیں بلکہ اس پر دوہری

---

[1] الاحزاب (۴۰) [2] سورۃ المائدہ (۳) [3] سورۃ سبا (۲۸) [4] سورۃ الاعراف (۱۵۸) [5] [illegible]

ذمہ داری ہے۔

چنانچہ اگر گذشتہ قومیں اور امتیں صرف اس بات کی مکلف تھیں کہ مخلص اور یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کریں۔ اور اپنی حدود میں رہتے ہوئے دین اور اس کی ذمہ داری پر قائم رہیں تو یہ آخری امت ان باتوں کی مکلف ہونے کے ساتھ ساتھ مزید برآں ایک اور ذمہ داری اپنے سر اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ ہے جانشین ہونے کی حیثیت سے اس دین کو پوری دنیا میں پھیلانا اور اس کی کوشش و محنت کرنا کہ خدا کا دین پوری دنیا پر چھا جائے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر [1]

ترجمہ: "تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکتے رہیں۔"

وقاتلوہم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ [2]

ترجمہ: "اے لوگو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کا ہو جائے۔"

تصدیق و اقرار کے بعد اس امت سے جو کام مطلوب ہے وہ اس عمل سے جڑا ہوا ہے جو سابقہ امتوں سے مطلوب تھا بلکہ زیادہ عظیم اہم اور بڑا تر ہے۔

اور جبکہ عمل کے بغیر صرف تصدیق و اقرار سے پچھلی امتیں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکتی تھیں اس لئے کہ اللہ نے ہدایت پر مبنی ذمہ داریاں ڈالی تھیں اور ان کے درمیان رسول صرف اس لئے نہیں بھیجے تھے کہ وہ صرف اللہ کا پیغام پہنچا دیں اور بس بلکہ اس قوم پر رسول کی اطاعت فرض کی گئی تھی تو یہ امت اس طور پر بھی ذمہ داری کو صرف تصدیق و اقرار

---

[1] سورۃ آل عمران (۱۰۴) [2] سورۃ الانفال (۳۹)

سے پورا نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اس امت پر یہ ایک ذمہ داری ہے کہ وہ بجائے خود شریعت الٰہی پر قائم ہو اور پھر ہدایات ربانی کو پوری دنیا میں پھیلائے۔

کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ صرف عہد ہی شرک کی نجاستوں سے پاک ہو سکتا تھا، کہ جزیرۃ العرب اور عالم اسلام کا وہ حصہ جہاں مجاہدوں کے ہاتھوں نور اسلام پہنچا اس کا معاملہ الگ ہی رکھیں، اگر مطلوب صرف تصدیق و اقرار ہی ہوتا۔

اور کیا کوئی تصور کر سکتا ہے، اگر مطلوب صرف تصدیق و اقرار ہے، کہ مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہو۔ چہ جائیکہ یہ مملکت پورے جزیرۃ العرب کو اپنے دامن میں سمیٹ لے اور اتنا ہی نہیں بلکہ نصف صدی میں اس کا دائرہ مغرب میں محیط اور مشرق میں ہند تک پہونچ جائے۔

اگر مطلوب صرف تصدیق و اقرار ہے! مسلمانوں نے یہی سمجھا ہوتا کہ مطلوب صرف تصدیق و اقرار ہے تو کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ مدینہ میں ایک مملکت کی بنیاد رکھی جا سکے اور حالت یہ ہے کہ اندرونی محاذ پہ یہودی اور بیرونی محاذ پہ مشرکین قریش سازشوں میں مصروف ہوں۔

اب ذرا دوسرے پہلو سے غور کریں۔

ہم پوچھتے ہیں: لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کے مطابق عملی زندگی کی جو تعمیر کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کر رہے تھے۔ کیا یہ سب کچھ اپنی طرف سے بس رضاکارانہ طور پر تھا، ان پر یہ ذمہ داری ڈالی نہیں گئی تھی؟

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک کس طرح دین حنیف کا مفہوم کیا تھا اس بارے میں بسا اوقات ہمارے ذہن الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں نے کتاب واقعنا المعاصر میں واضح کیا ہے کہ ان کے نزدیک جماعت کا امتیاز یہ نہیں تھا کہ انھوں نے فرمان خداوندی کی بجا آوری کی۔ اس لئے کہ یہ تو ایسی چیز ہے جو سب پر فرض ہے اور ہر جماعت سے مطلوب ہے۔ بلکہ ان کا امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے بے نظیر انداز میں اعلیٰ طریقہ پر ان فرامین کا نفاذ کیا۔

مثلاً اللہ نے قتال فرض کیا، حکم الٰہی پر لبیک کہنا سب پر فرض ہے۔ مخاطب اس کا ہر شخص ہے۔ مگر یہ واقعہ کہ ایک شخص جہاد کے لئے گھر سے جا رہا ہے، ہاتھ میں چند کھجوریں ہیں جنہیں کھا رہا ہے، جس کی وجہ سے قدم سوئے جنت دھیرے دھیرے اٹھ رہے ہیں، وہ سوچتا ہے اگر میں کھجور ختم ہونے کا انتظار کروں تب تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ چنانچہ کھجور پھینک کر میدان جنگ میں کود جاتا ہے اور شہید ہو جاتا ہے۔ یہ ہے حکم الٰہی کے نفاذ کا اعلیٰ درجہ۔ ورنہ قتال بجائے خود ہر ایک سے مطلوب ہے اور یہ کوئی امتیازی شان نہیں ہے۔

(زکوٰۃ جیسے) اللہ تعالیٰ نے مسلم معاشرہ کو حکم دیا کہ ان میں سے جن لوگوں پر اللہ نے مال و دولت کی فراوانی کی ہے وہ معاشرہ کے محتاج لوگوں پر خدا کی بخشی ہوئی دولت کو بانٹ کر اچھے کام میں شریک ہوں، اور زکوٰۃ کو اس کا وسیلہ بنایا جو مال دار اپنے زائد از نصاب مال سے نکالتے ہیں پھر حکومت اس مال کو ان ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ جیسے آیت کریمہ نے بیان کر دیا ہے۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل۔ (۶۰)

ترجمہ: یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے ہیں جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان لوگوں کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔

---

۱ سورۃ التوبہ (۶۰)

اسی طرح زکوٰۃ کے علاوہ بھی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہوا۔ اس انفاق کے لئے نصاب کی ضرورت نہیں ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

فی المال حق سوی الزکاۃ۔ لہ   مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔

اس جماعت کا راہ خدا میں خرچ کرنا بجائے خود کوئی امتیازی بات نہیں۔ اس لئے کہ اس کا مطالبہ تو ہر ایک سے ہے مگر یہ صورت کہ ایک شخص اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دے۔ یا یہ ماجرا کہ گھر میں مہمان آئے اور گھر میں کھانے کی مقدار اتنی ہی ہو جو اہل خانہ کے لئے ہو چنانچہ وہ اپنی بیوی سے کہے کہ چراغ بجھا دو اور بچوں کو بہلا کر سلا دو۔ پھر مہمان کے ساتھ بظاہر اس طرح شریک رہے کہ وہ بے تکلفی سے کھاتا رہے اور تمام ماحضر مہمان ہی کھائے پھر اللہ ان کی اس ادا پر فرمائے۔

ویؤثرون علی انفسهم | اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح
ولو کان بهم خصاصة ۲ے | دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج
۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ | ہوں۔

یہ ہے اعلیٰ مرتبت اور رضا کارانہ عمل (تطوع) جو گو کہ ان پر فرض نہ تھا اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس جماعت کی امتیازی صفات ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

الحلال بین والحرام بین | حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے
وبینهما مشتبهات۔ فمن | اور ان دونوں کے درمیان کی چیزیں مشتبہ
اتقی الشبهات فقد | ہیں تو جس نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا
استبرأ لدینه۔ ومن | اس نے اپنا دین بے داغ رکھا اور جو
حام حول الحمی اوشك | باڑھ کے قریب گیا تو خطرہ ہے کہ وہ اس

لہ اخرجہ ابن ماجہ (۱۸۵۵) ۲ے سورۃ الحشر (۹)

ان یقع فیه ۳ے ۔ ۔ ۔ میں گر جائے۔

مومنوں سے مطلوب یہ ہے کہ مشتبہ چیزوں سے پرہیز کریں تاکہ ان کا دین محفوظ رہے اور جو واضح طور پر حلال ہیں وہیں تک اپنے دائرۂ عمل کو بڑھائیں اور اس کے علاوہ سے دور رہیں۔ یہ ایسا حکم ہے جس میں ہر زمانے کے تمام مسلمان اس کے مخاطب ہیں مگر وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ:

"ہم حلال کے دس حصوں میں سے نو کو اس خوف کی وجہ سے چھوڑ دیتے تھے کہ کہیں حدود حرام میں نہ داخل ہو جائیں"

تو یہ ہے وہ تطوع (رضا کارانہ عمل) من جانب اللہ فرض نہ تھا اور یہی رضا کارانہ عمل ان کا امتیاز ہے۔ ہمارے ذہن میں جو بسا اوقات تطوع اور تکلیف میں الجھ جاتے ہیں ان واقعات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ من جانب اللہ فرائض کی ادائگی تو ہر ایک مسلمان پر یکساں فرض ہے کہ اس کا تارک گناہ گار ہے۔ جو بات اس طبقے کے ساتھ خاص ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے مستحب چیزوں کو بھی اس طرح ادا کیا گویا فرض ہیں۔ یہ ان کے ایمان میں گہرائی اور اس میں پختگی کی بات تھی۔ احکام خداوندی کی بجا آوری اعلیٰ درجہ کا احساس اور رضا کاری اس کا محرک تھی۔

جبکہ انھوں نے مستحبات کی ادائگی کا التزام بھی فرض ہی کی طرح کیا تو اب ذرا ان احکام خداوندی کی انجام دہی پر غور کریں جسے بالفعل تکلیف خداوندی تصور کیا گیا۔

کیا کتاب اللہ اور سنت نبوی کی پیروی اور ہر معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اتباع طیب دل سے نہیں رضا کارانہ (تطوعاً) طور پر کی جبکہ انھیں اس کا پابند نہیں بنایا گیا تھا؟

کیا اللہ کی راہ میں ان کا جوش جہاد جس پیشے طور پر تھا انھیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا؟

کیا حقیقی معنوں میں ایسی امت کا قیام جس کے ہر طبقہ میں اشتراک ہو۔ [illegible]

۳ے متفق علیہ۔

بھائی چارگی ہو، اچھے اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون ہو۔ جس میں ایک کی جان
خون، عزت و آبرو دوسرے پر حرام ہو گیا۔ یہ سب کچھ مطلوب نہ تھا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ انھوں
نے کیا وہ اپنی طرف سے تھا؟ ...

کیا لا الٰہ الا اللہ کی اخلاقی صفات سے آراستہ ہونا ان کا اپنی طرف سے اضافی عمل تھا
اصلاً انھیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

کیا ان کے ایفائے عہد کا عمل ذاتی نوعیت کا تھا جس کا انھیں پابند نہیں بنایا گیا تھا؟
اور کیا کبھی یہ بات ان کے ذہن میں آئی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ اصل ایمان پر زائد
رضاکارانہ عمل ہے اور یہ کہ صرف تصدیق و اقرار سے بھی ان کے دلوں اور عملی زندگی میں ایمان
موجود ہو سکتا ہے اگرچہ وہ اس طرح کا کوئی عمل بھی نہ کریں؟

یا ان کے دل کتاب اللہ اور رسول اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں اس یقین سے معمور
تھے کہ ان امور کی انجام دہی لا الٰہ الا اللہ پر ایمان کا تقاضا ہے۔ پھر انھوں نے اللہ
کی رضا کے لیے ان امور کو بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دیا۔

کیا یہ بات معقول نظر آتی ہے کہ اسلام کی تمام عملی تعلیمات اصل پر زائد ہوں اصل
میں داخل نہ ہوں؟

پھر اس دین کی قیمت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اور انسانی زندگی میں اس کا کردار ہی
کیا رہ جاتا ہے؟

کیا اللہ کتاب اسی لیے نازل کرتا، رسول اسی لیے بھیجتا، صبر و مصابرہ کی تلقین اسی
لیے کرتا اور جہاد کے تلخ جام پینے کی ترغیب اسی لیے دلاتا ہے کہ اس کا منطقی حاصل بس
دلوں میں چھپا رہے۔ اندرون میں پوشیدہ رہے۔ انسانی زندگی میں کوئی تغیر پیدا نہ کرے
جو حق کو نافذ اور باطل کو سرنگوں کرے، بھلائی کا چلن ہو، برائیوں کی سرکوبی ہو؟
اور کیا اسی کے لیے امت کو وجود بخشا گیا ہے؟

کنتم خیر امۃ اخرجت — اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو

للناس تأمرون بالمعروف — جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے
وتنہون عن المنکر — میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے
وتؤمنون باللہ ۔ ۱ — ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان
رکھتے ہو۔

کیا عقل اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہے کہ اس امت کے پیدا کیے جانے کا اصل
مقصد ہی ایک امر زائد ہو۔ یعنی وہ مقصود حاصل ہو یا نہ ہو اصل پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔
یا وہ یہ کہتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ اور اس کے تقاضوں کے درمیان ارتباط کا تعلق صرف
طبقۂ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تک ہی ضروری تھا۔ رہ گئی ان کے بعد آنے والی نسل تو اگر
وہ صرف تصدیق و اقرار کر لیں پھر کسی عمل کی ضرورت نہیں۔

کیا اس بات کے لیے قرآن یا سنت یا عقل سے کوئی حقیقی شہادت ملتی ہے؟
کیا کوئی نص (یا منطق) ایسی ہے جو کہے کہ کوئی معین طبقہ یا خاص افراد ہی وہ ہیں جن
کے لیے لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کی پابندی ضروری ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسروں کے لیے
دل سے تصدیق اور زبان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینا کافی ہے۔ اور جب تصدیق
و اقرار کرتے ہوئے کلمہ پڑھ لیا تو پھر تمام کا تمام مطلوب حاصل ہو گیا۔ اور پھر کسی اور چیز کے مطالبہ
کرنے کی کسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اب اگر وہ اپنی طرف سے لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں
کے مطابق کچھ کرتے بھی ہیں تو یہ ان کا اپنا رضاکارانہ عمل ہے۔ اور اگر وہ کچھ نہ بھی کریں تو ان کا کوئی نقصان
نہیں۔ اس لئے کہ وہ دولت ایمان سے بہرہ ور تو ہو ہی گئے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ طبقۂ اولیٰ نے لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کو اپنی ذات اور عملی زندگی
میں جس کامل درجہ میں پورا کیا ویسا پھر تاریخ میں دوبارہ نہ ہو۔ جب کہ آنے والی نسلیں بتدریج
ان سے دور ہوتی گئیں۔ اور پھر یہ دوری اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔ لیکن اس کی وجہ نہیں ہے کہ

---

۱ سورۂ آل عمران

طبقۂ اولیٰ ہی ان تکالیف کا مکلف تھا اور آنے والی نسلیں ان کی پابند نہیں اور نہ اس کا سبب یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کو ان تکالیف سے بری الذمہ کر دیا گیا تھا جو طبقۂ اولیٰ پر فرض تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن حالات اور ماحول میں طبقۂ اولیٰ کی پرورش ہوئی تھی اس نے انھیں تاریخ کا منفرد طبقہ بنا دیا۔ چونکہ انھوں نے دورِ جاہلیت بھی دیکھا اور اسلام بھی لہٰذا انھیں اس نعمت ربانی کا احساس تھا اور انھوں نے اس نعمت کی بھرپور قدر دانی کی اور اس کی نکھار کے لئے کوشاں رہے۔ پھر چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان تھے۔ بلا واسطہ آپ سے فیض پاتے۔ آپ کی زیر نگرانی تربیت ہوئی جس کی وجہ سے وہ مقامات کے بلند ترین مقام تک پہونچ گئے۔ اسی کے ساتھ یہ کہ کسی بھی نئی تحریک کے وقت انسان اپنی جتنی قوت و طاقت کو بروئے کار لاتا ہے، وہ بات پھر ان لوگوں میں نہیں ہوتی جو اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص اپنے ہاتھوں سے مکان بناتا ہے اور تعمیر میں اپنا پسینہ بہاتا ہے تو فطری طور پر وہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کسی طرح بھی اس عمارت پر آنچ بھی نہ آنے پائے۔

یہ حالات تھے جن میں اس نگارِ روزگار جماعت سے تقاضائے لا الٰہ الا اللہ کے نفاذ میں وہ بلند درجہ حاصل کیا کہ وہاں تک پھر دوسرے لوگ نہ پہونچ سکے۔ جہاں تک نفسِ تکالیف کا معاملہ ہے تو وہ سب کے لئے یکساں ہیں۔ اور وہ وہی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں موجود ہیں اور ان کی انجام دہی لا الٰہ الا اللہ پر ایمان کا تقاضا ہے، اس میں کسی گروہ یا طبقہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

اور اب ہم تیسرے نکتہ پر آتے ہیں اور پوچھتے ہیں: انسان سرشت کے اعتبار سے کیا یہ ممکن ہے کہ انسان ایمان تو کسی چیز پر رکھتا ہو لیکن اس کا عمل عملی طور پر اس ایمان کے تقاضوں کے خلاف ہو یا اس سے متصادم ہو؟

ہاں ایک ایسی حالت، جو مرض نفسیات کے نام سے معروف ہے وہ ہے غیر متوازن شخصیت۔ اس مرض کے شکار دو الگ الگ شخصیت کے حامل ہوتے ہیں جو

جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ گویا کہ ان دونوں میں سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ ایک شخصیت سراپا خیر ہوتی ہے جبکہ دوسری شخصیت میں وہ سراپا شر لگتا ہے۔ اعصابی دباؤ کی وجہ سے مریض پر کبھی یہ اور کبھی وہ حالت طاری ہوتی رہتی ہے جس پر مریض کو اختیار نہیں ہوتا۔ مریض کی ایسی حالت اس سے جواب دہی کی ذمہ داری ختم کر دیتی ہے... لیکن اس کے باوجود خود وہ حالت بتا دیتی ہے کہ کس کیفیت کے دباؤ میں ہوا ہے۔ یعنی وہ عمل رد عمل ظاہر ہو جاتا ہے جو اس نفسیاتی حالت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

مگر وہ حالت جو ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔ وہ ہے انسان کا اپنی طبعی حالت (ہوش و حواس) میں رہتے ہوئے دل میں کسی چیز پر ایمان رکھنا پھر اس کے تمام کاموں میں سے کوئی کام بھی ایسا نہ ہو جو دل میں چھپے ہوئے اس ایمان پر دلالت کرے۔ یہ فطرت انسانی کے اعتبار سے محال ہے۔ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ہاں جو چیز فی الواقع ممکن ہے وہ یہ ہے کہ ایمان تو کسی چیز پر ہو لیکن بعض اعمال میں ایمان کے تقاضے کے خلاف ہوں۔ یہ ایک طبعی حالت ہے۔ بلکہ انسان کے اعمال پر اسی حالت کا غلبہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ حالت بھی بلا سبب یونہی پیدا نہیں ہو جاتی۔ اور نہ وجہ سے خالی ہوتی ہے۔

جہاں تک اس حالت اسباب کا تعلق ہے تو نفس انسانی میں پابندیوں سے فرار کا ایک رجحان موجود ہے۔ یہ رجحان ان محرکات کے زیر اثر ہو جاتا ہے جو نفس کے اندر تنا میں کام کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے تکالیف مرغوبات نفس کے مقدار یا دائرہ پر ایک بندش ہے۔ اسی بنا پر جب نفس پر کوئی بندش نہیں رہ جاتی تو مرغوبات کی کشش تکالیف سے فرار پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن نفسیاتی مطالعہ کے بموجب بھی ایک چیز باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ ایمان، جو فطرت میں داخل ہے اس لئے کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان لانا چاہتی ہے، یہ ایمان بجائے خود مرغوبات پر بندش ہے جو [illegible] اثر انداز ہو کر متعین کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ایمان جس مقدار

کیفیت اس ہوا کی کے ہوتے ہوئے مرغوبات کو وہ آزادی نہیں ملتی جو اس قدر ایمان نہ ہونے کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ اور انسان کا عمل ان قوتوں اور ضوابط کا نتیجہ ہے جو اس کے اندر دین میں کام کرتے رہتے ہیں۔ پھر انہی قوتوں اور ضوابط کے تناسب سے وہ ایمانی تقاضوں پر اسی قدر تیز لبیک کہتا ہے یا پھر فرار اختیار کرتا ہے۔ اور انسان کی حالتیں اسی تعلق سے گاہے گاہے بدلتی رہتی ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایمان سے اس طرح خالی ہو جائے کہ پھر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جائے۔

یہ نفس انسانی کی حیثیت ہے۔ اسی لئے فقہا سے بہرہ ور علماء نے کہا ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ گناہوں سے گھٹتا ہے اور طاعت سے بڑھتا ہے۔

اور اس میں شک نہیں کہ دین قید ہے مباح مرغوبات کی کمیت پر اور ان کی کیفیت کی تحدید پر بھی۔ ارشاد خداوندی ہے :-

تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا ۱	یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں ان
تلک حدود اللہ فلا تقربوھا ۲	سے تجاوز نہ کرو یہ اللہ کی باندھی ہوئی
	حدیں ہیں ان کے قریب نہ پھٹکنا

خواہشات کے زیر اثر انسان جن مرغوبات پر فریفتہ ہوتا ہے ان کی حد بندی کر دی گئی ہے جسے مختصراً یہ آیت بیان کرتی ہے۔

زین للناس حب الشھوات	لوگوں کے لئے مرغوبات نفس عورتیں
من النساء والبنین والقناطیر	اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر چیدہ
المقنطرۃ من الذھب	گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں
والفضۃ والخیل المسومۃ	بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ
والانعام والحرث ذلک	سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے
متاع الحیوۃ الدنیا ۳	سامان ہیں۔ ۔۔

۱ سورۃ البقرۃ (۲۲۹) ۲ سورۃ البقرۃ (۱۸۷) ۳ سورۃ آل عمران (۱۴)

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض	لوگو زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں
حلالا طیبا ولا تتبعوا خطوات	ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے
الشیطان انہ لکم عدو مبین ۱	راستوں پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اور ارشاد ہے۔

ولا تنکحوا المشرکات	تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ
حتی یؤمن ولأمۃ	کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں،
مؤمنۃ خیر من مشرکۃ	ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی
ولو اعجبتکم ۲	سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	پسند ہو۔

نیز ارشاد ہے۔

واحل لکم ما وراء ذلکم	ان کے ماسوا جتنی ہیں انہیں اپنے
ان تبتغوا باموالکم	اموال کے ذریعہ سے حاصل کرنا تمہارے
محصنین غیر مسافحین ۳	لئے حلال کر دیا گیا ہے بشرطیکہ حصار
۔ ۔ ۔ ۔ ۔	نکاح میں ان کو محفوظ کرو نہ آزاد شہوت
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	رانی کرنے لگو۔

چنانچہ یہ سب مرغوبات کے دائرہ کی حد جاری ہی تو کر رہی ہیں۔ دین، حلال و حرام کی رکاوٹیں کھڑی کر کے شہوتوں کے دائرے اور کیفیات کو محدود کرتا ہے۔ مزید برآں دوسرے اور طریقوں سے بھی دین، شہوتوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر کے اس کے دائرے اور وسعت کو محدود کرتا ہے، جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، لا الہ الا اللہ کے اخلاقی تقاضے اور سب

۱ سورۃ البقرۃ (۱۶۸) ۲ سورۃ البقرۃ (۲۲۱) ۳ سورۃ النساء (۲۴)

بڑھ کر جہاد فی سبیل اللہ۔

اللہ تعالیٰ نے شہوت یا جذبات کو نفس انسانی میں بلا فائدہ نہیں رکھا ہے۔ یہ بات اللہ کی شان کے خلاف ہے کہ کسی بے کار چیز کو وجود بخشے۔ اور اسی طرح محرکات کی راہ میں بندشیں بھی اللہ نے بلا فائدہ نہیں لگا دی ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے کہ زمین میں خلافت کی جس مہم کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایسے محرکات ضرور ہوں جو تعمیر ارض کے لئے انسان کو عمل و حرکت اور جد و جہد پر آمادہ کریں۔ اور یہ انسان کے مطلوبہ ہدف کا ایک حصہ بھی ہے اور زمین پر انسان کے قیام کی غرض بھی۔

وإذ قال ربك للملائكة إني جاعل في الأرض خليفة ۔[1]	پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"
هو الذي أنشأكم من الأرض واستعمركم [2]	وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے۔

اسی طرح یہ انسان کے لئے لطف اٹھانے کا وسیلہ بھی ہے جو اللہ نے زمین میں انسان کو دے رکھا ہے۔

ولكم في الأرض مستقر ومتاع إلى حين [3]	اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گذر بسر کرنا ہے۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ آزمائش کا ذریعہ بھی ہے جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے

إنا جعلنا ما على الأرض زينة لها لنبلوهم أيهم أحسن عملا ۔[4]	واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سر و سامان زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ

[1] سورۃ البقرہ (۳۰) [2] سورۃ ہود (۶۱)

ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔

رہا معاملہ قید و پابندی کا تو اللہ تعالیٰ یہ جانتا ہے کہ یہ معتدل فطرت کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ مطلوبہ خلافت راشدہ کی ذمہ داریوں کو انجام دے سکے۔ اس لئے کہ رغبات کے لئے ایسی خود سپردگی جو مقررہ حدود سے تجاوز کا سبب بن جائے انسان کو ہلاک و برباد کر دیتی ہے اور ایک صالح انسان کو اس بلند مرتبہ سے دور کر دیتی ہے جو احسن تقویم کے شایان شان ہے، جس کے سبب ہی حیوان اور اس کے درمیان امتیاز قائم ہے اور جس کی وجہ سے وہ اس امانت کے اٹھانے کے لائق ہوا جسے اٹھانے سے آسمان و زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا..... اور انسان نے ہی یہ امانت اٹھائی۔

انسانی زندگی میں یہ پابندیاں دوہرا کردار ادا کرتی ہیں۔

انسان کے لئے شہوت و محرکات شہوت کی حد بندی کرتی ہیں، چنانچہ خواہش نفسانی میں تمام طاقت کو برباد نہیں ہونے دیتیں بلکہ اس کے کچھ حصے کو بچا رکھتی ہیں، دوسرے یہ کہ اس طاقت کے مصرف کی حد بندی کرتی ہیں، اور اس قوت کو خالص شہوانی دائرہ سے اٹھا کر ان صورتوں کی طرف پھیر دیتی ہیں جو انسانیت کے اعلیٰ وجود کو تشکیل دیتی ہیں اور یہی وہ امانت ہے جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں۔

اور اس طرح محرکات اور پابندیوں کے درمیان انسانی فطرت میں توازن قائم رہتا ہے اور اس کے احسن تقویم پر ہونے کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

لیکن انسان ہر حالت میں پوری طرح پابندیوں پر عمل پیرا نہیں ہو پاتا اور ہر حالت میں توازن بھی برقرار رہ پاتا ہے،

ولقد عهدنا إلى آدم من قبل فنسي ولم نجد له عزما ۔[1]	ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا، اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

[1] سورۃ طٰہٰ (۱۱۵)

ارشاد نبوی ہے۔

كل بني آدم خطاء وخير الخطائين التوابون ۱؎

ہر بنی آدم سے خطا ہوتی ہے اور بہترین خطاکار توبہ کرنے والا ہے۔

اور گناہ سرزد ہو ہی جاتا ہے۔

کسی ایک سبب یا پھر بیک وقت دونوں ہی اسباب کی وجہ سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔ یا تو اس وجہ سے کہ محرکات کا دباؤ سخت ہو جائے یا اس وجہ سے کسی وقت ضبط میں کمزوری آجائے یا یہ کہ بیک وقت دونوں ہی اسباب جمع ہو جائیں۔ جیسے دباؤ تو شدید ہو اور اس کے ساتھ ہی ارادہ اور ضبط میں کمزوری آجائے جو کمیت و کیفیت کی حد بندی کرتے ہیں پھر تو ان دو اسباب کے تناسب سے اس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ محرک کمزور ہو تو بآسانی اس پر قابو پایا جا سکتا ہے مگر محرک منہ زور ہو تو معاملہ قوت ارادی کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ اب اگر قوت ارادی مضبوط ہے تو محرک کو سرے سے دور کر دیتا ہے اور گناہ کا ظہور نہیں ہو پاتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو ہلکا پھلکا جیسے قرآن نے "[illegible]" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اگر قوت ارادی کمزور ہو تو دباؤ کے آگے پسپا ہو جاتی ہے۔

اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہی انسان کے لئے وہ مضبوط مددگار اسلحہ ہے جس کے ذریعہ شہوتوں کے دباؤ کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اور جس قدر ایمان مضبوط اور گہرا ہوگا اسی قدر اللہ کی مقرر کردہ حدود پر ان کو عمل پیرا ہونے کی قدرت ہوگی یعنی اسی تناسب سے وہ اللہ کے اوامر کی اطاعت کرے گا اور عائد کئے گئے فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان دائرہ بشریت سے نکل کر فرشتہ بن جائے گا بلکہ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ عبادت، نظم و ضبط اور فرائض کی ادائیگی زندگی میں اصل حیثیت اختیار کرے گی اور اس کے علاوہ جو کچھ ہوگا اس کی حیثیت سرسری ہوگی جس کی نہ کوئی اہمیت ہوگی اور نہ اس میں انہماک ہوگا۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس توصیف میں شامل ہو جائیگا۔

۱؎

والذين اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذكروا الله فاستغفروا لذنوبهم ومن يغفر الذنوب الا الله ولم يصروا على ما فعلوا وهم يعلمون اولئك جزاؤهم مغفرة من ربهم وجنات تجري من تحتها الانهار خالدين فيها ونعم اجر العاملين ۱؎

... ...

... ...

اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔ اور وہ کبھی دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا اچھا بدلہ ہے نیک اعمال کرنے والوں کے لئے۔

مگر جب ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کمزور ہو جائے تو کمزوری کے تناسب سے اندرونی احساسات کے باوجود متضاد رجحانات اصل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور احکام خداوندی پر ثابت قدمی کی صورت دھندلی ہو جاتی ہے جو بے راہ روی، گناہ اور فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ ان میں سے کسی حالت میں بھی ایمان کا اصل صفر نہیں ہوتا اور اس کا وجود صرف یکساں ہوتا ہے کہ انسان کوئی اسلامی عمل کرتا رہتا ہو۔

اور گناہ ۔ باجماع علماء ۔ انسان کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کر دیتا ۲؎

۱؎ سورۂ آل عمران ۱۳۵ ۔ ۱۳۶ ۲؎ خوارج اس اجماع میں شامل نہیں ہیں اور وہ غیر اسلامی فرقہ ہے۔

جو چیز دائرہ اسلام سے نکال باہر کرتی ہے وہ ہے "معصیت کو حلال کر لینا" گو یہ بالفعل اس کا ارتکاب نہ ہو۔ کسی معصیت کو اپنے طور پر حلال سمجھ لینا فی نفسہ معصیت میں مبتلا ہو جانے سے بالکل مختلف ہے۔

چنانچہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا وقت وہ ہوتا ہے جس میں انسانی طبیعت میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت آدمؑ سے چوک ہو گئی۔ اس حالت میں عزیمت کمزور ہو جاتی ہے چنانچہ شعوری طور پر ایمان کا تقاضا یاد نہیں رہ جاتا اگرچہ قلب میں ایمان پھر بھی موجود رہتا ہے۔ اور شاید یہی وہ چیز ہے جس کی طرف حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ کرتی ہے۔

لا یزنی الزانی حین یزنی — زناکار بوقت زنا مومن نہیں رہتا۔ اور
ولا یسرق السارق حین — چور چوری کرتے ہوئے مومن نہیں ہوتا۔
یسرق وھو مومن ۱ه

پھر انسان اس کمزوری کی حالت سے نکل آتا ہے۔ ہوش میں آتا ہے اللہ سے مغفرت چاہتا ہے چنانچہ اللہ اسے معاف کر دیتا ہے۔

مگر کسی حرام کو حلال قرار دے لینا بجائے خود اللہ کی اطاعت سے روگردانی اور اس کے احکام سے سرتابی ہے۔ گویا کہ ایسا انسان زبان حال سے کہتا ہے: ایسا تو اللہ کہتا ہے مگر اس معاملہ میں میرا فیصلہ دوسرا ہے۔ جیسا آدمؑ کو سجدے سے انکار کرتے وقت شیطان نے اپنی برتری کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا۔

انا خیر منہ خلقتنی من — میں اس سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ
نار وخلقتہ من طین ۲ه — سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔

یا جیسے کہا:

۱ه یہ قلب کا وہ نکتہ ہے جس سے کفر پیدا ہوتا ہے۔ ۲ه اخرجہ الشیخان ، ۳ه سورۃ ص (۷۶)

لم اکن لاسجد لبشر خلقتہ — میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ
من صلصال من حمأ — کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے
مسنون ۱ه — سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔

اور یہ وہ عمل ہے جسے اللہ معاف نہیں کرتا، اس لئے کہ یہ شرک ہے۔

ان اللہ لا یغفر ان — اللہ کے یہاں بس شرک ہی کی بخشش
یشرک بہ ویغفر ما دون — نہیں ہے اس کے سوا اور سب کچھ معاف
ذلک لمن یشاء ۲ه — ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔

لیکن اسلامی معاشرہ میں معصیت کی حد کیا ہے؟

کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا دائرہ اتنا پھیل جائے کہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجائے۔

پھر بڑھ کر اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ تمام اسلامی اعمال اس کی گرفت میں آجائیں۔

اور اس کے بعد بھی معاشرہ مسلمان رہتا ہے؟ صرف تصدیق و اقرار سے؟

اگر ہم بنیادی طور پر صرف تصدیق و اقرار کو ہی ایمان قرار دے دیں، اور کسی بھی عمل کے بغیر ایمان کا وجود تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ عمل ایمان کا جز نہیں ہے اور اس بنا پر یہ فیصلہ کر لیں کہ بس اتنا ہی دنیا میں مسلمان رہنے کے لئے اور آخرت میں دخول جنت کے لئے کافی ہے اگر یہ بات ہم ایک فرد کے لئے جائز قرار دے دیں تو کیا کسی دوسرے فرد کو اس حق سے محروم کر سکتے ہیں اور اگر تمام ہی افراد اس حق کا مطالبہ کر دیں تو کیا انہیں اس سے محروم کیا جا سکتا ہے۔

تو اگر ایسا ہی ایک مسلمان اور مومن معاشرہ وجود میں آجائے تو صورت کیا ہوگی؟

کیا ایسے معاشرہ سے وہ مقصد حاصل ہوگا جس کے لئے خدا نے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں؟

یاد دہانی کے طور پر ہم ان آیتوں کو دہراتے ہیں جو رسول بھیجنے اور کتابوں کے نزول کے مقصد کو متعین کرتی ہیں۔

۱ه سورۃ الحجر (۳۳) ۲ه سورۃ النساء

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

تو کیا مذکورہ معاشرہ میں انسان قسط پر قائم رہ سکتے ہیں؟

اور یاد دہانی کے طور پر ہم دوبارہ اس آیت کو بھی دہراتے ہیں جو خاص طور پر اس امت کے پیدا کئے جانے کے مقصد کو بتاتی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ ؂ ... ...

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ؂

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ، ھو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج، ملۃ ابیکم ابراھیم، ھو سمٰکم المسلمین من قبل، وفی ھذا لیکون

اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تمہیں اپنے کام کے لئے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی

؂ سورۃ آل عمران (۱۱۰) ؂ سورۃ البقرہ (۱۴۳)

الرسول شھیدا علیکم وتکونوا شھداء علی الناس، فاقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللہ ھو مولاکم فنعم المولیٰ ونعم النصیر ؂

(تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ وہ ہے تمہارا مولا بہت ہی اچھا ہے وہ مولا اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔ ... ...

تو کیا اس صورت میں ان مقاصد میں سے ایک مقصد بھی پورا ہو گا۔

کیا یہ ویسا ہی وہم (یا غلط روش) نہیں ہے جسے اللہ نے بنی اسرائیل کی مثال ذکر کر کے ہمیں آگاہ کر دیا ہے تاکہ ہم بھی اس میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

فخلف من بعدھم خلف ورثوا الکتاب یاخذون عرض ھذا الادنیٰ ویقولون سیغفر لنا وان یاتھم عرض مثلہ یاخذوہ الم یؤخذ علیھم میثاق الکتاب ان لا یقولوا علی اللہ الا الحق ودرسوا ما فیہ، والدار الاخرۃ للذین یتقون، افلا تعقلون؟ ؂

پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا، اور اگر وہی متاع دنیا سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو، اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے، آخرت کی قیام گاہ

؂ سورۃ الاعراف (۱۶۹) ؂ سورۃ البقرۃ

تو خدا ترس لوگوں کے لیے بڑی بشارت ہے کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے!

یا یہ ذمہ داری صرف بنی اسرائیل کے کندھوں پر ڈالی گئی تھی اور امت مسلمہ کو اس سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔

اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

نعم الاخوة لكم بنو اسرائيل ان كان لكم كل حلوة ولهم كل مرة	پھر تو بنی اسرائیل تمہارے بہترین بھائی ہیں کہ تمہارے لئے تو سب میٹھا میٹھا ہوا اور ان کے لئے سب کڑوا کڑوا۔

اب ایسا معاشرہ جس میں ایمان اور لا الہ الا اللہ کے تقاضوں کے برعکس اپنے نفسانی افکار پھیلے ہوئے ہوں جھاگ بن کر رہ جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، ایسا جھاگ جس کی خبر دیتے ہوئے اور جس سے ڈراتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

يوشك ان تداعى عليكم الامم كما تداعى الاكلة على قصعتها قالوا: أمن قلة نحن يومئذ يا رسول الله؟ قال: لا، انتم يومئذ كثير ولكنكم غثاء كغثاء السيل۔	قریب ہے کہ تم پر اس طرح قومیں ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے پیالوں کے گرد۔ لوگوں نے کہا کیا اس وقت ہم اقلیت میں ہوں گے یا رسول اللہ؟ فرمایا: اس وقت تم ہوگے تو بہت زیادہ مگر سیلاب کے جھاگ کی طرح۔

اور فی الحقیقت اقوام عالم اس جھاگ پر ٹوٹ رہی ہیں اور یہ تصدیق و اقرار پر قناعت کر کے اس خوش فہمی میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ دولت ایمانی تو حاصل کر ہی چکے ہیں۔

لیکن مسلم معاشرہ (جو شریعت الٰہی کے مطابق فیصلے کرتا ہے) میں بھی جس قدر اللہ نے مقدر کر دیا ہے گناہ ہو ہی جاتا ہے مگر دو باتیں ایسی ہیں جو ہر صورت باقی رہتی ہیں جس سے کوئی انسان دست بردار نہیں ہوتا تاکہ مسلم معاشرہ رہ سکے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ سلوک کیا جائے انجام خدا کے حوالے کر دیا جائے اور تاکہ دنیاوی زندگی میں مہلک عذاب سے نجات مل جائے، وہ دو چیزیں ہیں (۱) اتحاد اور (۲) شریعت الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنا۔ اور یہ دونوں چیزیں تیرہ سو سال تک اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کے بنیادی اعمال رہے ہیں (اندرونی طور پر چاہے وہ منافق و کافر ہی کیوں نہ رہے ہوں)۔ اگرچہ اس عرصہ میں نسلیں بہت سے انحرافات میں مبتلا ہو گئیں اور باوجودیکہ انھوں نے بہت سی اسلامی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کیا مگر ان دو چیزوں سے صرف آخری زمانہ میں علیحدگی اختیار کی گئی۔

غزل

• ابوالمجاہد زاہد

آسماں تک پہنچنا تو مشکل نہیں
یہ پرندے ہی اڑنے کے قابل نہیں

زندگانی تو ہے اک مسلسل سفر
زندگانی کی کوئی بھی منزل نہیں

مسئلے زندہ قوموں کی پہچان ہیں
مردہ قوموں کے کوئی مسائل نہیں

لیتے ہیں نام اس کا اٹھتے وقت پر
وہ بھی قائل ہیں اس کے جو قائل نہیں

کس سے تشبیہ دوں، کس کا جیسا کہوں؟
حسن میں کوئی تیرا مماثل نہیں

قاتلوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی
اور پکڑے گئے وہ جو قاتل نہیں

گالیاں بھی شرافت سے دیتے تھے جو
اپنی بستی میں اب وہ قبائل نہیں

کوئی صاحب دل اب ہے نہ صاحب نظر
تیری محفل بھی اب تیری محفل نہیں

تو بھی قرآن خواں میں بھی قرآن خواں
تو بھی عامل نہیں، میں بھی عامل نہیں

پھر کشش تو سیاست سے زاہد اگر
اس حسینہ میں حسن خصائل نہیں

تحریر: شیخ بدر القاسمی

ترجمہ: ذوالفقار علی فلاحی

الخوارزمی اور اس کی مشہور تصنیف

مفاتیح العلوم

خوارزمی کا پورا نام محمد بن عبد اللہ بن یوسف ہے، کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ کاتب کے لقب سے مشہور ہیں اور بلخ کے رہنے والے تھے۔ فلسفہ اور دوسرے علوم عقلیہ میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ علم فقہ اور اس کے اصول اور علم لغت میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ کا لقب کاتب فن تصنیف و تالیف میں آپ کے بلند مرتبہ پر دلالت کرتا ہے۔

مولف چوتھی صدی ہجری کے علماء میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ۳۸۷ھ مطابق ۹۹۷ء میں وفات پائی لیکن تاریخ پیدائش اور زندگی کی دوسری تفصیلات کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ملتا۔

مفاتیح العلوم کی تالیف انھوں نے وزیر ابوالحسن عبید اللہ العتبی کے لیے کی، چونکہ وہ علم اور اہل علم کی بڑی قدر کرتا تھا، شیخ خوارزمی نے یہ کتاب تصنیف کرکے اس کی خدمت میں پیش کی جیسا کہ انھوں نے کتاب کے مقدمے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خوارزمی کا ذکر ان کی کتاب کے ساتھ متعدد فہرستوں اور کتب تاریخ و اعلام میں آیا ہے لیکن ان میں ان کے شیوخ اور تلامذہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ جن کتابوں میں خوارزمی کا تذکرہ ملتا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) کشف الظنون ص ۱۷۵۰، (۲) ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۵۱
(۳) الاعلام للزرکلی ج ۵ ص ۳۱۲-۳۱۳، (۴) معجم المؤلفین ج ۹ ص ۳۰-۲۹
(۵) الخطط للمقریزی ج ۱ ص ۲۵۸، (۶) دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۹ ص ۱۷

کتاب کا تعارف:

مفاتیح العلوم کا شمار ان قدیم کتابوں میں ہوتا ہے جن کی تصنیف انسائیکلوپیڈیا کے طرز پر کی گئی ہے۔ یہ کتاب علمی دنیا میں بڑی اہمیت کی حامل اور مفید ہے اس لیے کہ اس میں ایک محقق کے لیے بیک وقت متعدد علوم و فنون کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک محقق اس کے مطالعے میں کافی محنت اور وقت صرف کرتا ہے۔ فی الحقیقت یہ کتاب متعدد علوم و معارف کی کلید ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن لیدن میں ۱۸۹۵ء میں اور دوسرا مکتبہ کلیات ازہریہ سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب متوسط سائز کے ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں قلمی نسخہ کے دو صفحات بھی شامل ہیں۔

مولف نے کتاب کی ترتیب نہایت ہی عمدہ اور منطقی رکھی ہے۔ اس میں دو مقالات ہیں، پہلا مقالہ علوم شرعیہ اور علوم عربیہ کے لیے مخصوص ہے۔ اور دوسرا مقالہ دوسری قوموں سے منقول عجمی علوم پر مشتمل ہے، جس میں منطق، فلسفہ، علم ہیئت اور علم کیمیا وغیرہ شامل ہیں۔ پہلے مقالے میں چھ ابواب ہیں اور ہر باب چند فصول پر مشتمل ہے۔

پہلا باب: علم الفقہ — اس میں گیارہ فصلیں ہیں۔

دوسرا باب: علم الکلام — اس میں سات فصلیں ہیں۔

تیسرا باب: علم النحو — یہ باب بارہ فصول پر مشتمل ہے۔

چوتھا باب: باب الکتابۃ — اس میں کل آٹھ فصلیں ہیں۔

پانچواں باب: باب الشعر والعروض — یہ کل پانچ فصول میں منقسم ہے۔

چھٹا باب: باب الاخبار — یہ باب نو فصول پر مشتمل ہے

دوسرا مقالہ ــــ نو ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب : باب الفلسفہ ــــ اس میں کل تین فصلیں ہیں۔

دوسرا باب : باب المنطق ــــ اس میں نو فصلیں ہیں۔

تیسرا باب : باب الطب ــــ اس میں آٹھ فصلیں ہیں۔

چوتھا باب : باب علم العدد ــــ یہ پانچ فصول پر مشتمل ہے۔

پانچواں باب : باب الہندسہ ــــ اس میں چار فصلیں ہیں۔

چھٹا باب : علم النجوم ــــ یہ چار فصول پر مشتمل ہے۔

ساتواں باب : باب الموسیقی ــــ یہ تین فصول پر مشتمل ہے۔

آٹھواں باب : باب الحیل ــــ اس میں دو فصلیں ہیں۔

نواں باب : باب الکیمیا ــــ اس میں تین فصلیں ہیں یہ کتاب کی آخری فصل ہے گویا کل ابواب کی مجموعی تعداد پندرہ ہے اور یہ پندرہ ابواب مجموعی طور سے ۴۹ فصول پر مشتمل ہیں۔

مؤلف نے اس کتاب میں صرف مختلف علوم کی اصطلاحات کی تشریح پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ کتاب کی فکر اور قدیم انداز ترتیب کی وجہ سے متعدد علوم کا خلاصہ پیش کرنے میں بھی اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے جس سے ہر قاری کو اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے نہایت ہی تھوڑی مدت میں ان تمام علوم کے مجموعے پر کتنی مہارت حاصل کر لی ہے۔ اسی طرح مؤلف نے عربی میں ترجمہ شدہ اصطلاحات کو نہایت باریک بینی کے ساتھ ان کے اصلی یونانی یا سریانی، فارسی اصطلاحات میں لوٹانے کا اہتمام بھی کیا ہے۔

انھوں نے کتاب کا آغاز باب علم الفقہ سے کیا ہے اور فقہ کے اصول مثلاً نص، اجماع، قیاس، استحسان، استصحاب کی تشریح و توضیح بھی ساتھ کی ہے۔ فقہی اصطلاحات میں طہارت، صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ وغیرہ کے ساتھ اونٹ، گائے اور بھیڑ کی عمریں، پیمانے اور باٹ جن کا استعمال مقدار معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے، شامل کیا ہے۔ اسی طرح حج

زکوٰۃ، طلاق، بیع و شرکات، دیات و فرائض وغیرہ اصطلاحوں کی مختصر تشریح کی ہے۔

علم کلام کی اصطلاحات میں سے ذات، جوہر، عرض اور طفرہ وغیرہ، فرقوں اور مسالک میں معتزلہ، خوارج، اصحاب الحروات، مجبرہ، مشبہ، مرجئہ، شیعہ وغیرہ کی اصطلاحیں شامل کی ہیں۔ اسی طرح ادیان و ملل میں سے نصرانیت، یہودیت اور ان دونوں کے مشہور فرقے، مزدکیہ، زنادقہ، مجوسیت، برہمنیت، سوفسطائیت، دہریت، ثنویت، بت پرستی (ان بتوں کے تذکرے کے ساتھ جن کی پرستش جزیرۃ العرب میں ہوتی تھی) کا ذکر بھی اس کے مقابلے میں کیا ہے۔

قواعد اللغۃ میں سے مبادیات علم نحو، بنیادی اصطلاحیں اور اعراب کی مختلف شکلوں کی تشریح بھی شامل ہیں۔ باب الکتابۃ میں کتابت کی اصطلاحیں، مختلف رجسٹر سازی کے اصول، خراج، مالیات، پوسٹ، فوج، جائداد و زمین، انفقات، پانی، زر، صوفیا، خطوط نویسی کے اسالیب اور رائج استعمال ہونے والی چیزوں کے نام اور اس فن میں معرب و دخیل کلمات کی حقیقت کی تشریح شامل ہے۔

باب الشعر میں اصطلاحات شعر، علم عروض، اور علم بدیع کا ذکر کیا ہے۔ اصطلاحات علم فلسفہ میں سے ہیولیٰ، صورت، واجب الوجود، عقل فعال، نفس کلیہ، روح، جسم، زمان اور خلا کا ذکر کیا ہے۔ اصطلاحات علم منطق میں، منطق کی بنیادی اصطلاحیں اور اس کے درج ذیل نو اصناف کا ذکر کیا ہے۔

(۱) ایساغوجی (مبادیات علم منطق) (۲) قاطیغوریاس (مقولات عشر) (۳) باری ارمینیاس (تعریفات) (۴) انولوطیقا (قیاس) (۵) انولوطیقی (اصول البرہان) (۶) طوبیقا (جدل) (۷) سوفسطیقی (مغالطات) (۸) ریطوریقا (خطابت) (۹) بویطیقی (شعر)

اصطلاحات علم طب میں علم تشریح، علم الامراض والادویۃ، علم الاغذیۃ، علم ادویۂ مفردہ، علم ادویۂ مشتبہ الاسماء، علم ادویۂ مرکبہ، اوزان و مکاییل اور نادر طبی اصطلاحات شامل ہیں۔

اصطلاحات حساب میں مفرد و مرکب اعداد، اشکال، نسبتیں، ضرب وغیرہ کے

حساب کی صورتیں، اسی طرح علم الہندسہ میں خطوط، بسائط اور مجسمات وغیرہ، اصطلاحیں شامل ہیں۔

علم النجوم میں سیارے، نجوم، ترکیب افلاک، نجومیوں کے آلات اور بروج سماویہ شامل ہیں۔ اصطلاحات موسیقی میں رباب، صنج، زیر، بم، دو وتار، قیثارہ، طنبور، عود وغیرہ شامل ہیں اور ایقاعات (آوازوں) نغمہ (طرح) خفیف و ثقیل کا مختصر تعارف شامل ہے۔

اصطلاحات کیمیا میں کیمیا کی عام اصطلاحیں اور اس میں استعمال ہونے والے اشارات مثلاً سونے کے لئے لفظ شمس، چاندی کے لئے لفظ قمر، تانبے کے لئے زہرہ کا لفظ وغیرہ۔

اس طرح یہ کتاب خوارزمی کے دور میں رائج تمام علوم کا خلاصہ اور اس کے مبادی و اصطلاحات کی تشریح محتاط اسلوب اور منظم منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

دوران مطالعہ قاری کو یہ بات محسوس ہوگی کہ مولف نے پہلے مقالے کے بالمقابل دوسرے مقالے میں زیادہ مہارت اور توجہ سے کام کیا ہے لیکن علوم شرعیہ فقہ، اصول فقہ اور قرآن و مسالک سے متعلق علوم کا بھی انھوں نے حق ادا نہیں کیا ہے اور نہ ان میں دقت نظر اور باریک بینی سے کام لیا ہے بہر حال اس میدان کی یہ پہلی کوشش ہے جسے انسائیکلوپیڈیائی انداز پر مرتب کیا گیا ہے۔

بقیہ ۴۹: جامعہ کے لیل و نہار

اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے تاکہ طالبات کی پریشانی دور ہو اور وہ زیادہ آسودگی اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس وقت جامعہ کے مرکزی گیٹ کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ خدا کرے کہ جامعہ کے شایان شان گیٹ بن کر اپنی خاموش زبان سے جامعہ کا ترجمان ہو۔

عبد البر اثری فلاحی

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: ملت اسلامیہ کے اتحاد میں حائل رکاوٹیں اور ان کا حل
مولف: حکیم خلیق الزماں
طابع: سن واٹر پلاسٹک ورکس پٹنہ ۴
ضخامت: ۶۴ صفحات
زر تعاون: ۳ روپے
کتابت و طباعت: عمدہ
ملنے کے پتے: (۱) کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴
(۲) مختار بک ڈپو، عالم گنج، پٹنہ ۷

ملت اسلامیہ کی موجودہ زبوں حالی نے ہر درد مند دل کو پریشان کر رکھا ہے، مولف کی یہ کتاب بھی اسی کے ایک اظہار اور اصلاح حال کے لئے ایک مثبت اقدام کی حیثیت رکھتی ہے چونکہ یہ زبوں حالی امت کے باہمی اختلاف و انتشار و پراگندگی کے سبب ہے اور اللہ کے اسی ارشاد "ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم" اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی سے روگردانی کا نتیجہ ہے اس وجہ سے مولف کا یہ نسخہ تجویز کرنا کہ امت کے اندر کسی نہ کسی طرح اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے۔ بہت صحیح علاج ہے۔ مولف نے مقصد تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "میرا مقصد کوئی نئی بحث شروع کرنا نہیں بلکہ اصل میں کامل اتحاد و اتفاق کی دعوت دینا اور کم سے کم تر درجہ میں مشترکہ مسائل میں مل جل کر کام کرنے کی ترغیب

اور ایک مشترک اور قابل قبول نمونہ تلاش کرتا ہے" صفحہ ۳۔۴

اسی مقصد کے حصول کے لئے مؤلف نے پہلے اتحاد و اتفاق کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا دقت نظر سے جائزہ لیا ہے ان کے نزدیک حائل رکاوٹوں میں ذات برادری کی تقسیم، فرقوں اور مسلکوں کا اختلاف اور جماعتوں اور تنظیموں کے تفرقے کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ پھر ان کے نقصانات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ان کے ازالے کے لئے طریقہ بتایا ہے اس سلسلے میں رسول اللہؐ، صحابہ کرامؓ، ائمہ عظامؒ اور اسلاف کے اسوۂ حسنہ کو بھی پیش کیا ہے۔ مختصراً اگر سمجھا جو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "الحب للہ والبغض للہ" ان تمام رکاوٹوں کا واحد حل ہے جو ان تمام کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔

مزید یہ کہ اشاعت سے قبل بہت سے اکابر ملت کے مسودے کی کاپیاں بھیج کر ان کے تاثرات، ہدایات اور مشورے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور تقریباً ۲۰ اکابر کی تحریروں کے اہم حصوں کو بھی کتاب میں جگہ دی ہے جس کی وجہ سے اس کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے اور کچھ نئے و مفید گوشے بھی سامنے آئے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب وقت کے ایک اہم تقاضے کی تکمیل کر رہی ہے جس کے لئے مؤلف سب کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے ان کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

کچھ قابل توجہ امور بھی ہیں توقع ہے آئندہ ان کی اصلاح کر دی جائے گی۔

(۱) کہیں کہیں اعراب کی غلطیاں ہیں مثلاً ملاحظہ ہوں صفحہ پر پیش کردہ حدیث کا اعراب۔

(۲) اسی طرح کتابت کی غلطیاں ہیں خاص طور سے عربی عبارتوں کی کتابت میں کئی جگہ غلطیاں ہیں مثلاً صفحہ ۱۲ پر للشوکانی ہے جبکہ للشوکانی ہونا چاہئے صفحہ ۱۳ پر ثلاثا مرات ہے جبکہ ثلاث مرات ہونا چاہئے۔ صفحہ ۲۳ پر سورۃ البینات ہے جب سورۃ البیّنۃ ہونا چاہئے وغیرہ

(۳) احادیث وغیرہ کے نقل کرنے میں اور الفاظ کا خصوصی لحاظ کرنا چاہئے ورنہ مفہوم کے بدلنے اور الٹنے پلٹنے کا اندیشہ رہتا ہے پھر یہ چیز علمی معیار کو بھی متاثر کرتی ہے مثلاً صفحہ ۲۲ پر آپ نے ایک حدیث نقل کی ہے جو اس طرح ہے

وقد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ وسنۃ نبیہ"

(میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہوں اگر تم انھیں مضبوطی سے پکڑے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے ایک تو اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور دوسرے میری سنت)

اولاً تو آپ نے حوالہ نہیں دیا کہ آپ نے یہ حدیث کہاں سے نقل کی ہے دوسرے یہ کہ جو متن آپ نے نقل کیا ہے بعینہ ان الفاظ سے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں نہیں ہے تیسرے یہ کہ جو متن آپ نے نقل کیا ہے اس میں اور پیش کردہ ترجمے میں فرق ہے الفاظ کی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔

یہ حدیث مؤطا امام مالک میں ہے اسی کے حوالے سے مشکوۃ المصابیح باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔

عن مالک ابن انس رضی اللہ عنہ مرسلاً قال: قال رسول اللہ: ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ"

امام حاکم نے اپنی مستدرک ج ۱ صفحہ ۹۳ میں یوں نقل کی ہے۔

"عن ابی ھریرۃ مرفوعاً: ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما کتاب اللہ وسنتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض۔"

پھر امام حاکم نے اپنی مستدرک ج ۱ صفحہ ۹۳ میں اور امام بیہقی نے یوں نقل کیا ہے

عن ابن عباس أن رسول اللہ خطب الناس فی حجۃ الوداع فقال: یا ایھا الناس انی ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابداً کتاب اللہ وسنۃ نبیہ۔"

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، شیخ عبیداللہ المبارکپوری ج ۱، ص ۲۸۹ - ۲۹۰)

ان حوالوں سے میرے پہلے اور دوسرے اعتراض کا جواب آپ بخوبی حاصل کر سکتے ہیں۔ رہا تیسرا اعتراض تو اسے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں آپ نے متن میں " وسنة نبيه " نقل کیا ہے جبکہ ترجمہ " اور دوسرے میری سنت " کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

(۳) صفحہ ۲۳ پر ہے " اور پھر آخر میں اس کا علاج تجویز کیا گیا ہے جس پر عمل کر کے امت کے افراد کامیاب و سرخرو ہو سکتے ہیں۔ اور منتشر کی جگہ اتحاد جلوہ افروز ہوگا ذات پات کے بجائے مساوات کا دور دورہ ہوگا مسالک کے بجائے قرآن و سنت کی شاہراہ ہموار ہوگی اور تنظیم و جماعت کے بدلے اجماعیت کا تصور عام ہوگا "

اس میں نشان زدہ جملے کا ربط آگے سے سمجھ میں نہیں آتا شاید درمیان میں کچھ حذف کیا گیا ہے اگر یہی بات ہے تو حذف کرنے کی علامت ..... ہونی چاہیے تاکہ قاری اندازہ لگا سکے یا پھر اس کے ربط کی تصحیح ہو جانی چاہیے۔

اخیر میں میں بھی آپ کی ہمنوائی کرتے ہوئے ہر ایک سے کہنا چاہتا ہوں۔

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں

ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

اعلان

۲ — ادارہ "حیات نو" مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم پر خصوصی نمبر نکالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ملک و بیرون ملک کے افراد سے ربط قائم ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس اس ضمن میں کسی طرح کی معلومات ہوں تو ادارہ ان کے تعاون کا مشکور ہوگا۔

غزل

مجاہد لکھیم پوری

تیرگی ہر منظر روشن میں بھر جاتی ہے رات
ساتھ اپنی ظلمتیں لے کر جدھر جاتی ہے رات

نیند بن کر دور کرنے کے لئے دن کی تھکن
جاگنے والوں کی آنکھوں میں اتر جاتی ہے رات

چاند اور تاروں سے پوچھو جو ہیں اس کے رازدار
روز کس کی جستجو میں دربدر جاتی ہے رات

خواب میں یا جاگ کر یا کروٹیں لیتے ہوئے
جس طرح گزرے بہر صورت گزر جاتی ہے رات

فرد ظلمت کی طرح ان کا ملن ممکن نہیں
جب سویرا جنم لیتا ہے تو مر جاتی ہے رات

خود فنا ہو کر مجاہد اہل دنیا کے لئے
جاتے جاتے دے کے پیغام سحر جاتی ہے رات

شہنواز قمر بنارسی
متعلم عربی پنجم

اخبار علمیہ

(۱) بین الاقوامی قرآن کمپٹیشن

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۹۲ء کو ملیشیا میں ایک بین الاقوامی مقابلہ قرآن منعقد ہو رہا ہے جس میں دنیا بھر کے ۴۰ سے زیادہ ممالک کے شرکاء حصہ لے سکیں گے جن کا تعلق کسی اسلامی اسٹیٹ یا اسلامی تنظیم سے ہو۔ یہ مقابلہ قرآن کی تلاوت و تجوید اور اس کی تفسیر پر مشتمل ہوگا۔ مقابلہ کا انعقاد (Marina Intercontinental Hotel) کے (Islamic Solidarity Hall) میں ہوگا۔ (مسلم ورلڈ نیوز)

(۲) ۴۰ لاکھ الفاظ پر مشتمل اردو لغت کی تیاری آخری مراحل میں

اسلام آباد: اردو لغت بورڈ کے زیر اہتمام اردو کی جامع لغت تیار کرنے کا کام اب آخری مرحلہ میں ہے۔ کراچی میں بورڈ کے چیئرمین نے بتایا کہ لغت کی تمام جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ یہ ایک جامع اور مکمل لغت ہوگی جس میں تقریباً ۱۰ لاکھ نئے الفاظ اور تقریباً ۴۰ لاکھ پرانے الفاظ کے مختلف معانی شامل ہوں گے۔ (دعوت)

(۳) اسلام آباد میں قائم:
یونیورسٹی، جامعہ اسلامیہ کو ۳۰۰ ہیکٹیر زمین کی پیشکش

اسلام آباد: پاکستان نے اسلام آباد میں جامعہ اسلامیہ کے کیمپس کی تعمیر کے لئے ۳۰۰ ہیکٹیر زمین پیشکش کی ہے۔ یہ یونیورسٹی جس کی بنیاد ۱۰ سال پہلے بعض عرب ممالک کی مالی امداد سے

ڈالی گئی تھی، اب اس کا قیام اسلام آباد میں جامع الملک فیصل (پاکستان کی مشہور مسجد) سے متصل ہوگا۔

جامعہ کے نائب پرنسپل اور صدیقی نے بتایا ہے کہ جامعہ کی تعمیر کے پہلے مرحلہ کی لاگت ۲۲ ملین امریکی ڈالر تک پہنچتی ہے اور پاکستان اس کی نصف مقدار کی پیشکش کرے گا اور دوسری طرف مجلس انتظامیہ کے دوسرے ممبران ممالک دوسری نصف مقدار فراہم کریں گے۔

دوسرے اور تیسرے مرحلہ میں جامعہ طلبہ کے لئے ۱۰ (۱۹۹۷ء) معاشیات، عربی زبان، اسلامک اسٹڈیز اور سوشل سائنس کی تعلیم کے لئے چار سال کے کورس کا نظم کرے گی۔ جامعہ میں اب تک مندرج رجسٹرڈ طلبہ کی تعداد ایک ہزار ہے، ان میں سے نصف ان دیگر ممالک کے ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

جناب صدیقی نے یہ واضح کیا کہ جامعہ میں ۵۰ طلبہ چین کے صوبہ Sin - Kiang کے ہیں۔

(اخبار العالم الاسلامی)

ایک نئی کتاب:

"اہتمام الاسلام بالحیوان"

حافظ بشیر احمد مصری کی تصنیف کردہ کتاب "اہتمام الاسلام بالحیوان" (Animal in Islam) کا شمار ان اہم مطبوعات میں سے ہوتا ہے جن کی اشاعت حال ہی میں مغرب میں ہوئی کیونکہ یہ ایسے مسئلہ سے بحث کرتی ہے جو مغربی دنیا میں ایک حساس موضوع کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ وہاں جانوروں پر شفقت اور ان کے ذبح کرنے کے طریقے جنہیں عام طور سے پائی جاتی ہیں۔

مولف اپنی کتاب میں اس بات کی توضیح کرتے ہیں کہ اسلام ان نظریات وقوانین سے کہیں پہلے سبقت لے جا چکا ہے جن پر آج مغربی دنیا میں عمل کیا جا رہا ہے اور جانوروں پر شفقت و رحمت کا دعویٰ کرتے ہیں کیونکہ اسلام نے چودہ سو سال پہلے ہی جانوروں کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنے کی دعوت دی ہے۔

مؤرخ نے اپنی کتاب میں نبی کریمؐ کے وہ بہت سے ارشادات نقل کئے ہیں جو اس حقیقت کی دلیل ہے کہ سب سے پہلے اسلام ہی نے جانوروں پر شفقت و رحمت کی دعوت دی ہے۔ مثلاً

عن ابی یعلی شداد ابن اوس رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: (ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیء فاذا قتلتم فاحسنوا القتلة واذا ذبحتم فاحسنوا الذبحة ولیحد احدکم شفرته ولیرح ذبیحته) رواہ مسلم فی کتاب الصید۔

شداد بن اوس کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا :-

"اللہ نے ہر چیز کو عمدہ طریقے سے انجام دینا فرض کیا ہے لہٰذا جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب (کسی جانور کو) ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور تم میں کا ہر فرد چھری کو تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔"

(اخبار العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ)

بقیہ: حلقۂ یاراں :

لیکن میری یہ التماس سوچ اس وقت زیادہ ہوگی جب بچے "حیات نو" کا تازہ شمارہ دے کر ماں کو دکھانا۔ ایک بار پھر شکریہ۔

ایک تازہ غزل بھیج رہا ہوں۔ اگر کسی لائق ہو تو قریبی شماروں میں شائع کر لیں۔

دعاؤں میں یاد رکھیں۔ آپ کا مخلص ایم۔ کے شمسی اوگنوی :

محترمی ایڈیٹر صاحب سلام مسنون !

مدت مدید سے آپ کا رسالہ ہمارے "دارالمطالعہ" میں آرہا ہے اور میں بہت دلچسپی سے اس کا ابتداء تا انتہا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ رسالہ واقعی کافی خوبیوں کا حامل ہے۔ بہت ساری معلوماتی باتیں اس میں رہتی ہیں۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ خود اس کا ممبر بن جاؤں۔ کیا اس رسالہ میں ہم لوگوں کے مضامین بھی شائع ہو سکتے ہیں ؟

فقط

عبدالمالک رضوی سیکنڈ جی اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

مولانا نور محمد صاحب فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جامعہ تعلیمی سال کے دوسرے ششماہی میں داخل ہے۔ مگر ادھر چند مہینوں سے ملک میں خصوصاً شمالی ہندوستان میں جو فتنہ و فساد برپا ہے اس سے سب سے زیادہ نقصان طلباء اور تعلیم کو پہنچا ہے۔ جامعۃ الفلاح کا تعلق چونکہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہے اور اتفاق سے ان دنوں طلبہ اپنے گھروں پر تھے۔ حالات خراب ہونے کی وجہ سے کافی تاخیر سے جامعہ پہنچ سکے جس کی بنا پر ان کی تعلیم کا کافی نقصان ہوا۔

● **جامعۃ الفلاح کو صدمہ :—**

۴ دسمبر ۱۹۹۰ء کی دوپہر میں معلوم ہوا کہ محترم مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سابق ناظم جامعۃ الفلاح و سابق امیر جماعت اسلامی ہند اعظم گڑھ اسپتال میں ہیں۔ شام کو اساتذہ کا ایک وفد مولانا سے ملنے کے لئے اسپتال پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہیں اور آرام سے ہیں۔ دوسرے دن مجھ کو معلوم ہوا کہ مولانا پر دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ فوراً ہی اساتذہ کا ایک وفد اعظم گڑھ ڈاکٹر صاحب کے گھر پہونچا۔ مولانا سے ملاقات کی گئی، بلکہ مولانا کو کار پر بٹھایا گیا اور گھر سے اسپتال پہونچایا گیا۔ اس وفد میں راقم بھی شامل تھا۔ جامعہ میں پہونچ کر طلباء کے لئے خصوصی دعائیں کی گئیں۔ ہر شخص بے چین تھا کہ مولانا سے ملاقات کرے، اگرچہ کہ ڈاکٹر صاحب نے ملنے سے روک دیا تھا اس لئے اپنی اپنی جگہ لوگ دعاؤں میں مصروف رہے، مگر جب وقت آجاتا ہے تو دوا اور دعا کارگر نہیں ہوتی۔ بالآخر مولانا ۵ دسمبر کو ۱۱ بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اوقات سے باہر رابطہ قائم تھا جوں ہی مولانا کے رحلت کی خبر جامعہ کا ہر فرد سراپا حزن و ملال بن گیا۔ اساتذہ و طلبہ کا عجیب حال تھا۔ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو

وہاں بھی تمام تعمیر تو بند ہوگئی ہر شخص مولانا مرحوم کے لئے دعاؤں میں مصروف تھا۔

بذریعہ فون لکھنؤ، دہلی، بنارس اور مختلف مقامات پر اس حادثہ کی خبر دی گئی۔ ادھر اعظم گڑھ سے مولانا کی جسد خاکی کو چاند پٹی کے لئے لایا جا رہا تھا تو جامعہ کے طلبہ و اساتذہ قطار در قطار سراپا انتظار بن کر سڑک کے دونوں کنارے کھڑے ہو گئے اور مولانا مرحوم کو مسجد میں رکھا گیا۔ تمام اساتذہ و طلبہ نے نزدیک جا کر باری باری سے مولانا مرحوم کے پرسکون چہرے کا دیدار کیا۔ اس کے بعد مولانا کو چاند پٹی لے جایا گیا، ظہر بعد سے جامعہ کی دونوں بسوں سے طلبہ و اساتذہ کو چاند پٹی پہنچانا شروع کر دیا اور نماز جنازہ بعد عصر تک پہنچاتی رہیں۔ اس طرح سے تمام ہی لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی اور مولانا کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا۔ اس موقع پر محترم مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب سابق ناظر جامعۃ الفلاح بھی اپنی بیماری کے باوجود تشریف لائے۔ موصوف کالی دیہنگ رہنے والے ہیں۔

۸ دسمبر سنہ۹۰ء کو جامعہ میں تعزیتی پروگرام رکھا گیا جس میں بہت سے اساتذہ اور طلبہ نے مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور آخر میں بارگاہ رب العزت میں مرحوم کے لئے دعائے مغفرت اور بلندی درجات کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔

● مولانا اعجاز اسلم صاحب سکریٹری جماعت اسلامی ہند بھی تعزیتی پروگرام میں شریک رہے۔ موصوف کو جامعہ دیکھنے کی شدید خواہش تھی مگر افسوس کہ مولانا کی زندگی میں جامعہ نہ دیکھ سکے۔ موصوف نے اساتذہ و طلبہ کے سامنے مولانا مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کی۔

● اس موقعہ پر محترم امیر حلقہ اترپردیش جناب مولانا محمد شفیع ذاکی صاحب بھی موجود تھے موصوف نے مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی

مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر ریڈیو کے ذریعہ سن کر مختلف جگہوں سے بہت سے وفود پہنچے، جامعہ پہنچے اور پھر چاند پٹی روانہ ہوئے اور مولانا کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔

● ۸ دسمبر کو بعد نماز عشاء سکریٹری انجمن نے مقامی ارکان شوریٰ انجمن طلبہ قدیم اور

جامعہ، تنظیم فلاحی برادران کا ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا۔ جس میں مولانا کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی اور ان کے لئے بلندی درجات کی دعائیں کی گئیں۔ اس میں ایک تعزیتی قرارداد بھی پاس کی گئی، جو مندرجہ ذیل ہے۔

تعزیتی قرارداد بسلسلہ وفات مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی ؒ

تاسیس تحریک اسلامی سابق امیر جماعت اسلامی ہند، سابق ناظم جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی اور سرپرست انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی ؒ کی ۵ دسمبر سنہ ۱۹۹۰ء کو حرکت قلب کے بند ہو جانے سے انتقال پر ملال پر انجمن طلبہ قدیم اپنے گہرے رنج و غم اور کرب اور افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ ان کے جملہ پسماندگان کے لئے صبر جمیل اور مولانا مرحوم کے لئے مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرتی ہے۔

انجمن کی تاسیس ہی سے مولانا کا اس سے جو گہرا تعلق رہا اور جس طرح ہمیشہ ان کی شفقت و رہنمائی اسے حاصل رہی نیز وابستگان انجمن پر انہیں جو اعتماد اور جس طرح کی توقعات وابستہ تھیں اس کی بنا پر انجمن کا شدید احساس ہے کہ مولانا مرحوم کے انتقال سے بلاشبہ انجمن اپنے محسن، مربی اور مخلص رہنما سے محروم ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف انجمن بلکہ جامعۃ الفلاح تحریک اسلامی، ملت اسلامیہ، برادران وطن اور پوری انسانیت اپنے بے لوث خادم کی محرومی کے سانحہ سے دوچار ہوئی ہے۔

اس کا یہ بھی احساس ہے کہ مولانا جن جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک رہے اس کا بدل نظر نہیں آتا۔

انجمن جملہ وابستگان سے عموماً اور ابنائے قدیم جامعۃ الفلاح سے خصوصاً درخواست کرتی ہے کہ مولانا کے انتقال سے بیزاری و قنوطیت کا شکار نہ ہوں بلکہ ان کے مشن کو لے کر آگے بڑھیں اور اس کے لئے مولانا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تن، من، دھن کی بازی لگا دیں اور مولانا نے اپنی مومنانہ بصارت و بصیرت، قائدانہ صلاحیت، وقار سنجیدگی، سادگی و قناعت صبر و ثبات، علم و تدبر، استغناء، توکل علی اللہ اور اصابت رائے کا جو اسوۂ حسنہ چھوڑا ہے

اس کے مطابق اپنے کردار کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔ انجمن نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے انجمن کے مجلہ "حیات نو" کا خصوصی شمارہ شائع کیا جائے تاکہ مولانا کی شخصیت پوری طرح نکھر کر لوگوں کے سامنے آ جائے۔

- کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح کے استاذ محترم جناب مولانا محمد ایوب صاحب اصلاحی کے بڑے صاحبزادے کا آگرہ میں حادثہ سے دوچار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں جگہ دے اور مولانا کو اور مرحوم کے بیوی بچوں کو اور اعزہ و اقربا کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

- مولانا مشتاق احمد فلاحی صدر مدرس مدرسہ مصباح العلوم بھوکونیاپتی سابق منفرم جامعۃ الفلاح کی والدہ محترمہ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کو اپنے رب سے جا ملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اپنی جنت میں جگہ دے۔ آمین۔ نیز متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے اور برادرم مشتاق احمد فلاحی صاحب کو ان کے لئے دائمی اجر کا ذریعہ بنائے۔

- جامعہ کے ایک استاذ ماسٹر علی نور صاحب چاند پٹی کی والدہ محترمہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ماسٹر صاحب نیز دوسرے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

- ہمارے ایک فلاحی بھائی برادرم فیروز احمد ملک جو کہ جامعہ ملیہ میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ ان کے والد محترم ۱۰ دسمبر کو کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک فالج کا حملہ ہوا اور چند ہی گھنٹوں میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں کو معاف کرے، متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے اور برادرم فیروز احمد صاحب کو مرحوم کے لئے اجر و ثواب کا باعث بنائے۔ آمین۔

انجمن ان تمام لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

- جامعہ میں آزادی درسگاہ کی دو منزلہ عمارت کی صفائی اور اس کا پلاستر ہو چکا ہے۔ اس وقت سے کمپلکس میں بچیوں کی درسگاہ کی تعمیر کا کام بڑی تیزی سے جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ

(بقیہ : صفحہ ۵۸ پر)

محمد اسمٰعیل فلاحی

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

۲۰ دسمبر ۱۹۹۰ء کی شب میں ہر حلقہ و ہر مکتبۂ فکر میں مقبول اور عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھے جانے والے قائد و رہنما، رفیق، اور سابق ناظم جامعۃ الفلاح مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی مرحوم دورۂ قلب پڑنے کے نتیجہ میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کئے گئے۔ جہاں فوراً علاج میں ایمرجنسی کی سہولت فراہم کی گئی۔ جن لوگوں نے سنا اسپتال پہونچے، ہاتھ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ رب سے دعائیں اور التجائیں کی جانے لگیں لیکن مشیت الٰہی پوری ہو کر رہی اور ۲۱ دسمبر ۱۹۹۰ء کی صبح ساڑھے دس بجے اس دار فانی سے دار البقا کی طرف کوچ کر گئے۔ اس جانکاہ و الم انگیز خبر کا جامعہ پہونچنا تھا کہ جو جہاں تھا وہیں گم صم ہو گیا۔ یارائے ضبط نہ رہا، پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ دفتر تعلیمات اور اساتذہ کے کمروں میں سسکیاں بندھ گئیں۔ طلبہ کا سمندر بے اختیار باہر نکل آئے اور جب مولانا مرحوم کا جسد خاکی اعظم گڈھ سے چاند پٹی جاتے ہوئے جامعہ کے پاس سے گذرا تو سڑک پر طلبا و اساتذہ کا ہجوم غفیر تھا، جس سے گاڑی آگے نہ بڑھ سکی اور ایمبولینس کو گاڑی کا رخ جامعہ کی طرف موڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لوگوں نے تھرتھراتے ہونٹ اور بھیگی پلکوں کے ساتھ اپنے رہنما، مربی اور سرپرست کو دیکھا۔

دوسرے روز جامعہ کی تاریخ کا طویل ترین تعزیتی جلسہ بڑی جذباتی اور رقت انگیز فضا میں ہوا اور شرکائے اجلاس نے عزم و ثبات کے اس پہاڑ اور سادگی، للہیت، استغنا اور زہد و توکل کے اس مثل جلیل کو نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کیا۔

پروگرام کا آغاز سکریٹری جمعیۃ الطلبہ عزیزم جاوید سلطان کی تلاوت آیات سے ہوا۔ صدر جلسہ

مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے بتایا کہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں مجھے مولانا مرحوم کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، مرحوم نے مجھے علم بلاغت کی کتاب دلائل الاعجاز پڑھائی تھی۔ تقسیم ہند تک مولانا مرحوم ہی مقامی امیر تھے۔ تقسیم کے بعد ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل جدید کے موقع پر وہ امیر جماعت اسلامی ہند منتخب ہوئے۔ وہ ایک عہد تھا جو ۱۹۴۸ء میں شروع ہوا اور دسمبر ۱۹۷۲ء میں ختم ہوا۔

مرکز جماعت رامپور میں مرحوم کی صحبت میں ۱۸ سال رہنے والے مولانا [illegible] اصلاحی نے مرحوم کی علمی صلاحیت اور حسن اخلاق اور سادگی کو سراہا اور بتایا کہ مرحوم نے جماعت کو نہایت مشکل حالات اور پرآشوب دور میں سنبھالا وہ مولانا ہی کا حصہ تھا۔ اس وقت وہ کون سی جماعت نہیں تھی اور کون سا حلقہ نہ تھا جس کی طرف سے مخالفت نہ رہی ہو۔

سابق صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے گلوگیر آواز میں فرمایا مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب میں مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوا تھا گھر کی جدائی ناقابل برداشت تھی واپس جانا چاہتا تھا۔ مرحوم نے اپنی آغوش شفقت میں لے لیا اور والد محترم سے کہا آپ جائیے۔ اس دن سے یہ آغوش شفقت مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔ جماعت کی تشکیل جدید کے بعد کچھ عرصہ تک مدرسۃ الاصلاح عارضی طور پر جماعت کا مرکز تھا۔ مرحوم ہم لوگوں سے مرکز نقل کرواتے اور لکھواتے۔ آج اللہ کے فرزند جناب ابوسعید ہی یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہزاروں ہزار افراد سوگوار اور لائق تعزیت ہیں۔ سابق صدر جامعہ نے بتایا کہ مرحوم کی جامعہ کی نظامت کے زمانہ میں مرحوم نے بنارس کے سیمینار کے موقع پر اپنے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے نام ایک مکتوب گرامی میری معرفت بھیجا، جس میں ان سے تشریف آوری کی دعوت دی گئی تھی علاوہ موصوف کی زبان سے دعوت، اس پر کہتے ہوئے بے ساختہ یہ جملہ نکلا تھا "صاح ابو اللیث اذکرنی من ابی الحسن" مولانا نے شکایت کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا کہ شخصیت کی قدر شناسی اور چیز ہے اور شخصیت پرستی اور چیز — شخصیت کی قدر شناسی امر مستحسن ہے۔ سابق صدر کا احساس تھا کہ اس پہلو سے ہم سے بھول کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا عبدالماجد دریابادی مرحوم بھی مولانا کی اصابت رائے اور حکمت و تدبر کے معترف تھے۔ پاکستان کی جماعت سے انھیں بھی شکایت تھی

لیکن یہاں سے نہیں۔ ہمارا بعض نوجوان طبقہ مولانا سے شاکی ہی تھا کہ انھیں تیز قدم اٹھانا چاہئے تاکہ منزل فوراً آجائے۔ اصلاحی صاحب نے انھیں ہوشیار کیا کہ یہ دراصل سستی جال ہے اور یہ سستی جال کا شکار ہوں۔ مولانا مرحوم نے ایک سلسلہ مقالات لکھا تھا جس میں نقل مکانی کرنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو تلقین کی گئی تھی کہ نقل مکانی اگر ایک وقت ہجرت الی اللہ کے مفہوم میں نہیں ہے انھیں یہیں رہ کر اسلام کا علم بلند کرنا چاہیے۔ مرحوم کے ان مقالات کو مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پسند کیا اور اس سے اتفاق کیا تھا۔

سکریٹری جماعت اسلامی ہند جناب اعجاز اسلم صاحب مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم کی علالت کی خبر سن کر انتقال سے قبل تشریف لے گئے تھے۔ اس نشست میں وہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ خواہش ہی نہیں بلکہ حسرت رہی ہے کہ اس عظیم درسگاہ میں حاضری کا موقع ملے جو تحریک اسلامی کے لئے افراد تیار کر رہی ہے لیکن ایسے موقع پر آنا ہوا جو حسرت و اندوہ کا موقع ہے۔ سکریٹری جماعت نے یاد دلایا کہ مولانا ابواللیث مرحوم نے کس طرح اس ادارے کو سینچنے میں اپنا خون جگر لگایا ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ آزادی کے بعد تحریک اسلامی ہند کی تاریخ ابواللیث اصلاحی مرحوم کی بھی تاریخ ہے۔ تقسیم کے وقت جبکہ امیدیں چکنا چور ہو چکی تھیں اور مستقبل کی راہیں مسدود تھیں، مرحوم نے بے مثال تقویٰ، اعتماد علی اللہ اور معاملہ فہمی سے کام لے کر اس جماعت کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے طے کر لیا تھا ہم اقامت دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہیں کریں گے۔ مولانا نے دنیوی مال و متاع نہیں جمع کیا۔ بال بچوں کے مستقبل کی فکر نہیں کی۔ فکر تھی تو بس یہ کہ اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا، اس میں بسنے والے مسلمانوں اور انسانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ اخلاص و بے لوثی کس چیز کا نام ہے؟ دیکھنا ہو تو مولانا کی زندگی دیکھیں۔ مسلم مجلس مشاورت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دوسری انجمنوں اور جماعتوں کے افراد محسوس کرتے تھے کہ جماعت اسلامی بڑی خوش نصیب ہے کہ اسے ابواللیث اصلاحی مرحوم جیسا مخلص اور بے لوث خادم ملا ہے۔

امیر حلقہ اترپردیش جناب محمد رفیق قاسمی صاحب نے فرمایا جو شخص بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے یہ دنیا ایک روز چھوڑنی ہے، کوئی آج اور کوئی کل۔ یہی حقیقت ہے

کہ کسی کے اٹھ جانے سے لوگوں کی آنکھیں بھیگتی ہیں، لوگ حسرت و یاس کا مجسمہ بن جاتے ہیں اور کسی کے اٹھ جانے پر لوگ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔ امیر حلقہ نے مرحوم کی معاملات اور ہمدردی و غمخواری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شہادت اور پرسنل لاء بورڈ کے ممبران عوام کے درجے کے نہیں تھا لیکن اس کے باوجود مرحوم کی قدر و منزلت کا یہ عالم ہوتا کہ مجلس پر مولانا کا رنگ ہوتا، لوگ مولانا کی بات غور سے سنتے اور تسلیم کرتے۔ مولانا کی بات میں جذبات کی روانی ہوتی اور نہ حدود و قیود سے بے لگامی و لاپروائی، نہایت جچے تلے الفاظ ہوتے۔

امیر حلقہ نے بتایا کہ کبھی کبھی جب ملک کے حالات کا تذکرہ کرتا اور کہتا اب کس دن کا انتظار کر رہے ہیں، کب آگے بڑھیں گے؟ مولانا ملول ہو جاتے، جواب دیتے "ان بوڑھی ہڈیوں سے تم کیا چاہتے ہو، چلتا ہوں پاؤں جواب دے دیتے ہیں"۔ تحریک اسلامی کے آگے ہندوستان کے علماء، حکومت اور عام افراد نے رکاوٹوں کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ لیکن مرحوم نے پامردی، ہمت و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ آج شدید ضرورت ہے کہ ہم مولانا کے مشن کو لے کر آگے بڑھیں اور لوگوں کو امن کا پیغام دیں۔

استاد جامعہ مولانا انعام الدین صاحب اصلاحی مرحوم کے بھانجے/بھتیجے ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مرحوم نے تحریک اسلامی کو دولت، وقت، دماغ سب دیا اور کبھی حکومت کی پرواہ نہیں کی۔ اپنی زندگی اور اپنے خاندان کو بھی دنیوی خوشحالی اور دولت سے بہت دور رکھا۔ مرحوم کو کسی نے اسپتال پہنچا گیا تھا اور ان کے جمعدار کو بے کرائے دے دیں دیا۔ چار دن میں میں نے نہیں سنا کہ اپنے لڑکے یا لڑکی یا بچے کے آئندہ کے بارے میں کوئی بات کی ہو کہ جائداد کا کیا ہوگا، ایسا کرنا، اس طرح جمع کرنا، حالانکہ یہ کوئی غیر معقول بات نہیں ہوتی۔ میں نے مرحوم سے تین سوال سوچے تھے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ ایک سوال کر ہی ڈالا کہ جماعت کے لیے کچھ کیجیے۔ انھوں نے جواب دیا کچھ کر رہا ہے، لکھوں گا یوں سو مرحوم ایک تصنیف تیار کر رہے تھے اور اسے نقل کیا تھا، سو صفحات تک نقل کر چکا تھا۔ انھوں نے اس کا نام نہیں رکھا تھا لیکن اگر رکھا جائے تو یہ ہوگا "مولانا ابواللیث مرحوم کی سوانح حیات مکاتیب کی شکل میں"۔ ایک مرتبہ مرحوم نے کہا ابھی تو عجیب و غریب چیزیں ہیں بعد

مل جائیں گی۔

استاد جامعہ مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی نے فرمایا کہ مجھے بھی مولانا سے ترمذی شریف پڑھنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ مرحوم اصلاح میں اس طرح مطالعہ میں غرق رہتے کہ طالبعلم کے اندر حصول علم کا شوق ابھرتا۔ مولانا صغیر احسن صاحب نے بتایا کہ وہ صرف صاحب قلم ہی نہیں تھے، صاحب عمل اور مرد میدان بھی تھے۔ اس سلسلہ کا انھوں نے ایک عملی واقعہ بھی سنایا جو کہ ان کے گاؤں زمین رسول پور میں پیش آیا تھا کہ کس طرح منصوبہ بند حملہ آوروں کے مقابلہ میں مولانا مرحوم نے نوجوان اور بوڑھوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تھی۔

استاد جامعہ مولانا شبیر احمد صاحب اصلاحی مرحوم کی نظامت جامعہ کے زمانہ میں صدر جامعہ رہ چکے تھے۔ مولانا شبیر صاحب نے بتایا کہ میں مولانا مرحوم کا شاگرد بھی ہوں اور ان کی نگرانی میں بھی رہنے کا شرف حاصل ہے۔ وہ بڑے اچھے مربی تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر نظر رکھتے اور معمولی معمولی اصولی باتوں پر سخت گرفت کرتے اور مناسب رہنمائی دیتے تھے۔

استاد جامعہ مولانا محمد طاہر صاحب عمری نے مولانا مرحوم کی سادگی پسندی، قناعت، استغناء کی پیکر شخصیت کا ذکر کیا اور کہا ہمارے اسلاف ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ ہمیں اسلاف کے کردار کی جھلک مولانا مرحوم کے کردار میں ملتی ہے۔ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۲ء کے پُرآشوب دور میں ایک تاریخ ساز شخصیت کی ضرورت تھی۔ جماعت بڑی خوش نصیب تھی کہ اسے بالغ نظر بلند نگاہ اور حکمت و فراست رکھنے والی قیادت نصیب ہوئی جس نے دعوت کے کام، ملی مسائل اور دیگر ضروری باتوں کی اہمیت محسوس کی اور ایک متوازن پالیسی بنائی۔

استاد جامعہ و سابق نائب صدر مولانا محمد فرقان خان صاحب فلاحی نے مرحوم کے سابق نام شبیر محمد کا ذکر کیا، کہا وہ واقعی شبیر محمد تھے اور اپنے والد محترم کے حوالہ سے مولانا صغیر احسن اصلاحی کا بیان کردہ واقعہ مزید تفصیلات کے ساتھ سنایا۔ ان کے والد محترم بھی اس واقعہ میں شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم نے دنیا بنانے کی کوشش نہیں کی۔ جو لوگ باہر بیرون ملک جاتے ان کو بھی نصیحت کرتے باہر جا کر کیا کروگے، یہاں رہ کر دین کا کام کرو۔ جب تک وہ کام وقت

اور دین کی خدمت کر سکتے تھے اسے باقی رکھا۔ اور جب معذور ہو گئے، گھر گئے تو اپنے پاس بلا لیا۔
مرحوم کے ساتھ سفر کا تذکرہ کیا اور کہا میں نے سوچا تھا قلی کیا کروں گا، مولانا مرحوم نے کہا قلی کرو گے پھر مرکز پہونچنے پر باصرار قلی کا پیسہ دیا۔ مرکز جانے پر باصرار ایک دو وقت کھانے میں اپنے ساتھ ضرور شریک کیا کرتے تھے۔

مولانا مطیع اللہ صاحب فلاحی نے بطور خاص مولانا مرحوم کی دو صفات کا تذکرہ کیا ایک مقصد پر نظر: مقصد کے لئے فدائیت اور مقصد کیلئے خلوص۔ دوسرے امانت و دیانت انھوں نے کہا کہ مرحوم ملت اسلامیہ کے لئے امین تھے۔ بڑے اچھے انداز اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس امانت کی حفاظت کی۔ تحریک کی خدمت اور حق کی سربلندی کے لئے جناب کچھ قربان کردیا۔ اتنے بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود کبھی خواہش نہیں ہوئی کہ نمائشی انداز اختیار کریں۔ پوری زندگی اس پر گواہ ہے۔ جو اللہ کے لئے مخلص ہوتا ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے اندر دنیا داخل نہ ہو۔ آزادی کے زمانہ میں ملت اسلامیہ جس دلدل میں پھنسی تھی اس سے نکال کر مرحوم نے اسے اس مقام پر پہونچایا کہ مسلمان اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے شرم محسوس کرنے کے بجائے آج فخر کرتا ہے۔ جس زمانہ میں مدینہ میں تعلیم حاصل کرتا تھا، مولانا مرحوم نے کہا تھا تم لوگوں سے بڑی امیدیں تھیں، تم لوگ ادھر چلے گئے۔ خیر تعلیم حاصل کرنے سے فائدہ ہوتا ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ تعلیم کے بعد کہیں آؤ، یہاں قحط الرجال ہے۔ مرحوم کے ساتھ سفر کرنے کا مجھے بھی اتفاق ہوا ہے۔ مرحوم کا دل ہر وقت اللہ کی یاد میں لگا رہتا تھا۔ سفر میں بھی نماز قضا نہیں ہوتی۔ حتی الامکان اپنا کام خود کرتے۔

مولانا نور محمد صاحب فلاحی نے کہا مرحوم کی زندگی کے جس گوشہ پر نظر ڈالی جائے حسین ہے۔ وہ عالم باعمل تھے، وہ قائد تھے، مرد مجاہد تھے، شفیق باپ اور بہترین مربی تھے، وہ دن کے سپہ سالار اور رات کے عابد شب بیدار تھے۔ مولانا حیدرآباد کے کل ہند اجتماع کے موقع پر جب کوئی رکن جماعت نہیں تھا کہنے لگے "ابھی میں تو جانتا تھا تم رکن جماعت ہو"۔ تربیت کا یہ کتنا پیارا انداز تھا بنارس سیمینار کے موقع پر مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی کے ساتھ مجھے بھی علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی مرحوم کی خدمت میں دعوت نامہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ دعوت نامہ قبول کرتے ہوئے کہا

مرحوم کے بارے میں انھوں نے کہا تھا "کان شیر محمد آذکی من ابی الحسن" ان کی پوری زندگی تحریک میں لگ گئی، اگر وہ کتابوں کی تصنیف و تالیف میں آتے تو بہت آگے جاتے مگر مرحوم نے "تصنیف رجال" کیا۔ سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم سے مولانا ابواللیث مرحوم کی پہلی ملاقات ہوئی۔ سید صباح الدین مرحوم کا کہنا تھا مولانا کو دیکھ کر صحابہ کرام کی زندگی یاد آگئی دہلی کے لئے مولانا کا جو آخری سفر تھا اس میں مولانا نور محمد صاحب شریک سفر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا نے باصرار ایک بریف کیس لے لیا اور سیڑھیوں پر چڑھتے اترتے بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے رہے۔ باربار تاکید کرتے رہے کھانا کھاؤ۔ دوران سفر رات میں آنکھ کھلی دیکھا تہجد کی نماز پڑھ رہے ہیں اور دیر تک ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہے ہیں۔

وہ جب بھی دہلی جاتے اور مولانا سے ملاقات کئے بغیر کہیں چلے جاتے تو مولانا بار بار لوگوں سے معلوم کرتے کہ نور محمد کہاں غائب ہے اور اپنے یہاں کھانا کھلائے بغیر واپس نہیں ہونے دیتے۔

مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی نائب صدر جامعہ کہہ رہے تھے کہ مولانا کا متبسم، باوقار مسکراتا چہرہ نگاہوں میں گھوم رہا ہے، اتنی دل آویز، اتنی پیاری شخصیت۔ مرحوم ان عظیم ہستیوں میں تھے جن کے اٹھ جانے سے گھر والے ہی یتیم نہیں ہوئے بلکہ بے شمار لوگ اپنا اپنے کو یتیم تصور کرتے ہیں۔ میرا تعلق مولانا سے ۱۹۵۴ء سے رہا ہے۔ رامپور میں میری رہائش گاہ مولانا کے گھر سے بالکل قریب تھی۔ مولانا کی سادگی، امانت، دیانت کا ہم لوگ جو تذکرہ کرتے ہیں یہ خالی خولی باتیں نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے ٹھوس حقائق اور واقعات ہیں۔ مرحوم غیر معمولی عزم و حوصلہ اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ یہ مولانا ہی کا دل گردہ تھا کہ تحریک کی نیا کو کھینے کے لئے اس وقت تنہائی، نامساعد حالات میں اپنے کو تیار کرلیا۔ غیروں کی طرف سے کیچڑ کے چھینٹے، اپنوں کے فتووں اور مخالفتوں نے بھی زخمی کیا۔ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب سے میں نے تذکرہ کیا کہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ حملہ انتہائی شدید ہے لیکن چہرہ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ مولانا نے جواب دیا ۴۴ سال ساتھ رہا ہوں کتنے مواقع آئے ہم لوگ گھبرا گئے لیکن مولانا کے پائے ثبات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ مولانا محمد سلامت اللہ صاحب نے مرحوم کی دیانت داری، خودداری۔

معاملہ فہمی اور عزم کے متعدد نمونے سنائے۔

ماسٹر محمد جنید صاحب نے کہا وہ زندگی کے راز کو جانتے تھے دنیا کی حقیقت سے واقف تھے یہی وجہ ہے کہ دنیا سنوارنے کی کوشش نہیں کی مصنوعی معیار زندگی پسند نہیں کیا، حالانکہ ان کے جیسے ذہین آدمی کے لئے یہ کوئی مشکل چیز نہیں تھی۔ کوئی ان سے بڑھ نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اس طرح کے انسانوں کے بارے میں کتابوں میں تو پڑھا ہے لیکن ایسا عظیم آدمی نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ وہ ہم لوگ کے روحانی باپ، محترم اساتذہ کے استاد اور ہماری تحریک اسلامی کے قائد تھے۔ آج انھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وضعداری، دل سوزی، تدبر، فہم و فراست، وہ ایک [illegible] تھے۔ جماعت کو [illegible] نہایت کو بہت کچھ دیا۔ پوری ملت ایک زبردست خلا محسوس کرے گی۔ وہ ہر مجلس [illegible] صدر مجلس ہوتے چاہے صدارت کوئی اور کر رہا ہوتا۔ جماعت کے مخالفین بھی مولانا پر جان دیتے تھے۔ مولانا [illegible] سے دل متعلق ہوتے [illegible] وہ مولانا کی خوبیوں کو یاد کر کے روتے تھے۔ اللہ تعالیٰ دولت اور صحت تو کسی کو بھی دے دیتا ہے لیکن دینداری اور حسن اخلاق سب کو نہیں دیتا۔ یہ نعمتیں انہی کو دیتا ہے جو اس کے برگزیدہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو بے پناہ صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اگر وہ ذرا توجہ کرتے تو اپنی زندگی کو نہایت اعلیٰ معیار کا کر سکتے تھے لیکن انھوں نے پائیدار و نیایت کم [illegible] اور دنیا کو [illegible] دنیا اور آخرت نے [illegible] مولانا مرحوم کے چہرے [illegible] پرسوز اور درد مند دل تھا۔ متعدد مسائل پر گر کر [illegible] گفتگو کی روزانہ [illegible]۔ ڈاکٹر سبحانی صاحب نے عربی شاعر کے الفاظ میں اس حسرت کا اظہار کیا کہ اگر جان دے کر گزرنے والے کی زندگی بچائی جا سکتی تو میں اپنی جان کو فدیہ کے طور پر پیش کر دیتا لیکن یہ اپنے بس میں نہ تھا۔

سکریٹری جمعیۃ الطلبہ عزیزم جاوید سلطان کی دادی مولانا مرحوم کی چھوٹی بہن ہوتی ہیں۔ جاوید نے بتایا کہ جماعت کی ذمہ داریوں اور دوسری مشغولیتوں کے باوجود مولانا ابو اللیث اصلاحی

ندوی مرحوم اپنے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتے۔ جب وطن آتے وقت نکال کر دوسرے گاؤں اپنی بہن یعنی میری دادی سے ملنے ضرور آتے اور بار بار ایسا ہوتا کہ انھیں چاندنی لیکر آتے اور واپس جانے سے ایک روز قبل انھیں میرے گھر ہو جاتے۔ جب بھی آتے ضرور دادی جان کو کچھ نہ کچھ دیتے۔ دادی ان کے حالات سے واقف تھیں انکار کرتیں لیکن زبردستی دیتے۔ مولانا مرحوم کی دوسری اہم خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے۔ چند ماہ قبل میں نے اپنے ایک کام کے لئے ان سے چاہا انھوں نے معذوری ظاہر کی اور کہا مجھے ایسا کرتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے لیکن میرے کچھ اصول ہیں۔ میں ان کی پابندی کرتا ہوں مجھے مجبور نہ کرو۔

مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی جو اس پروگرام کے کنوینر تھے انھوں نے فرمایا:
مولانا مرحوم کی ایک بڑی اہم خوبی یہ تھی جس میں سوائے امام حسن البنا شہید کے کوئی ان کا ثانی نہیں وہ یہ کہ [illegible] علماء [illegible] بیسوی صدی میں جتنی تحریکیں اٹھیں ان کی قیادت کرنے والے جدید طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ صرف مولانا ابو اللیث مرحوم کی شخصیت ایک ایسی ہے جو ایک مدرسے سے فارغ تھی۔ اور انھوں نے طویل مدت تک ایک زبردست اسلامی تحریک کی قیادت کی۔ جس کے زیر قیادت جدید تعلیم یافتہ افراد اور مدارس کے فارغین بھی اکٹھا ہو گئے اور انھی مولانا نے فراست اور سیاسی بصیرت کے ساتھ قیادت کی کہ علماء کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

مولانا ابو اللیث صاحب مرحوم نے تحریک اسلامی کی پکار پر اس وقت لبیک کہا جب دوسرے علماء نے شدید مخالفت کی۔ یہ بڑے دل گردہ کی بات ہے۔ یہ اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جو اعلیٰ شجاعت، بہادری اور دلیری [illegible] شیر ہو۔

عزیزم ابوبکر متعلم عربی [illegible] نے مجلس کی مناسبت سے ایک نظم پڑھی اور سب کو رلا دیا۔

آخیر میں مرحوم مولانا کی مغفرت اور بلندی درجات کے لئے دعائیں کی گئیں اور اس طرح یہ تعزیتی اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

حلقۂ یاراں

عزیز القدر مولانا محمد اسمٰعیل فلاحی صاحب،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حسب فرمائش "ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل" سے ایک باب "حیات نو" کے لئے پیش خدمت ہے۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ حیات نو کا دینی و علمی معیار روز افزوں ہے۔ جدید علماء کو اکیسویں صدی عیسوی کے چیلنجوں کے لئے ہمارے مدارس اور علمی رسائل کو ابھی سے مختصر اور طویل المیعاد منصوبہ سازی اور ان پر عمل آوری شروع کر دینی چاہئے کیونکہ آنے والے دنوں میں ملک اور بیرون ملک اسلام اور مسلمانوں کو بعض نہایت پیچیدہ اور مشکل ترین سوالات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جن سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ ڈاکٹر محمد فلاحی صاحب اور اساتذہ کرام کی خدمت میں خاکسار کا ہدیہ سلام مسنون پیش فرمائیں۔ خدا کرے آپ تمام حضرات بعافیت ہوں۔

خیر اندیش

والسلام

احمد سجاد (رانچی)

تسلیمات

محترم!

خدا آپ کو بخیریت رکھے۔

"حیات نو" کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ شکریہ۔ ہماری توقع تھی کہ آپ بھول جائیں گے۔ چونکہ اس مشینی دور میں انسانی زندگی بہت مصروف ہو کر رہ گئی ہے۔ خود انسان کو اپنی فکر نہیں، ایسے میں کون کس کو یاد کرتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶۶ پر)